جنوری ۱۹۸۹ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
حکم و عبر (دو فکری خواب اور ان کی تعبیر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۴
ہدایت القرآن (قسط نمبر ۲۸)	مولانا محمد تقی امینی	۱۷
مقدمہ "لغات و اعراب قرآن"	پروفیسر حافظ احمد یار	۲۴
تحفظِ اجناس خوردنی : قرآنی نقطۂ نظر سے	پروفیسر احمد الدین ماہروی	۳۳
حکمتِ اقبال (قسط نمبر ۱۶)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۷
قرآن مجید اور مستشرقین	سید شبیر حسین شاہ زاہد	۴۷
قرآن سے اقبال کی محبت	تنویر قیصر شاہد	۵۹
تبصرۂ کتب	ادارہ	۶۴

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

	اعلیٰ	اشاعتِ عام
مُسلمانوں پر قرآنِ مجید کے حقوق	۸-۰۰	۶-۰۰
راہِ نجات (سورۃ العصر کی روشنی میں)	۸-۰۰	۳-۰۰
قرآنِ حکیم کی سُورتوں کا اجمالی تجزیہ	۱۲-۰۰	
مطالعۂ قرآنِ حکیم کا منتخب نصاب	۱۵-۰۰	
قرآن اور امنِ عالم	۲-۰۰	
دعوت الی اللہ	۳-۰۰	
رسُولِ کامل ﷺ	۱۰-۰۰	۵-۰۰
نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت		
نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلّق کی بنیادیں	۴-۰۰	۲-۰۰
معراج النبی	۴-۰۰	
شہیدِ مظلوم (حضرت عثمان ذوالنورینؓ)	۵-۰۰	۳-۰۰
سانحۂ کربلا (شہادت حسینؓ کا اصل پس منظر)	۴-۰۰	۳-۰۰
اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام	۲-۰۰	
اسلام میں عورت کا مقام	۱۲-۰۰	۶-۰۰
عظمتِ صوم	۲-۰۰	
عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی	۴-۰۰	

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدّین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

جلد ۸ | جنوری ۱۹۸۹ء مطابق جمادی الاوّل ۱۴۰۹ھ | شمارہ ۱

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۴۰ روپے فی شمارہ -/۴ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

'حکمتِ قرآن' کی آٹھویں جلد کا پہلا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ زیرِ نظر شمارے سے پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کی تالیف "لغات و اعرابِ قرآن" کی سلسلہ وار اشاعت کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ جس کے مقدمہ کا نصفِ اوّل اسی شمارے میں شامل ہے۔

حافظ احمد یار صاحب کی ذات قارئینِ 'حکمتِ قرآن' کے لیے تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ حافظ صاحب کا تعاون مرکزی انجمن خدام القرآن کو یومِ تاسیس ہی سے حاصل رہا ہے۔ حافظ صاحب کی پوری زندگی تعلیم و تعلّمِ علومِ اسلامیہ میں گزری۔ قرآن حکیم اور عربی زبان ابتدا ہی سے حافظ صاحب کے خصوصی دلچسپی کے مضامین تھے۔ تعلیمی دَور کا بیشتر حصہ اگرچہ سکول، کالج اور یونیورسٹی ہی میں گزرا لیکن دینی مدارس سے رابطہ بھی رہا اور ایک دینی مدرسے میں درسِ نظامی کے ابتدائی چند سال بطور متعلم گزارے۔ جامعہ پنجاب میں اگرچہ آپ شعبۂ اسلامیات سے وابستہ رہے اور یہ وابستگی آپ کی ریٹائرمنٹ تک برقرار رہی لیکن اس پورے عرصے میں بھی آپ کی دلچسپی کے اصل موضوعات 'قرآن حکیم' اور 'عربی زبان' ہی تھے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کا نام ہی غالباً حافظ صاحب کے لیے ایسا پُرکشش تھا کہ انجمن کی 'قرآن کانفرنسوں' اور 'محاضراتِ قرآنی' میں جب بھی حافظ صاحب کو شرکت کی دعوت دی گئی، انہوں نے اسے خیر مقدم کہا اور کوئی سال ایسا نہ گیا جب اُن کا مبسوط مقالہ شاملِ کانفرنس یا محاضرات نہ ہوا ہو۔ قرآن اکیڈمی میں، جو مرکزی انجمن کا ایک اہم تعلیمی منصوبہ ہے، جب تعمیراتی کام کی ایک حد تک تکمیل کے بعد تعلیمی پروگرام کا آغاز ہوا تو حافظ احمد یار صاحب نے جو اس وقت تک یونیورسٹی سے ریٹائر ہو چکے تھے، عربی زبان کے استاذ کے طور پر اپنی خدمات انجمن کو پیش کیں اور قریباً ہمہ وقت استاذ کے طور پر اکیڈمی میں تدریس کا فریضہ سنبھال لیا۔ عربی زبان خصوصاً گرامر پر حافظ صاحب کی گرفت، اُن کا طرزِ تدریس اور پھر لگاتار پڑھانے کا سٹیمنا، یہ چند ایسی امتیازی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر حافظ صاحب بجا طور پر رشک کے لائق ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان سے پڑھنے کے بعد کوئی اور استاد طالب علموں کی نظر میں جچتا نہیں ہے۔ ہماری انست میں مرکزی انجمن اور حافظ صاحب

کا 'فرقان' اتفاقی نہیں بلکہ اللہ کی تائید و نصرت کا مظہر ہے۔

قرآن اکیڈمی کے دو سالہ تدریسی نصاب میں جب 'ترجمۂ قرآن' کی کلاس کا آغاز ہوا اور مدرس کی تعیین کا مرحلہ آیا تو نظرِ انتخاب پھر حافظ احمد یار صاحب پر گئی۔ انہوں نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اس اہم ذمہ داری کو بھی خوش دلی سے قبول کیا اور اس انداز سے اپنی اس ذمہ داری کو ادا کیا کہ طلبہ روزانہ کئی کئی گھنٹے لگاتار عربی قواعد کے اجراء کے ساتھ ترجمۂ قرآن پڑھتے لیکن نہ ان کی آتشِ طلب میں کوئی کمی آتی نہ حافظ صاحب کے شوقِ تدریس میں کوئی تفاوت واقع ہوتا۔ اس نہج پر ایک سال میں ترجمۂ قرآن کی تکمیل پر حافظ صاحب نے محسوس کیا کہ یہ کام انتہائی مفید ہی نہیں وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ انہیں اس ضرورت کا احساس بھی ہوا کہ اگر اس طور پر قرآن حکیم کی لغت اور اعراب کی بحث کو اردو زبان میں ضبطِ تحریر میں لایا جا سکے تو اُن طالبانِ علمِ قرآن کو جو عربی زبان پر مکمل عبور نہیں رکھتے، قرآن حکیم کے سمجھنے میں بہت سہولت ہو جائے گی بلکہ عربی زبان اور اس کے قواعد سے بھی وہ بہت حد تک آشنا ہو جائیں گے۔ پھر ممکن ہے کہ ان کا ذوقِ طلب انہیں عربی زبان کو مستقل بنیادوں پر سیکھنے اور تعلیم و تعلّمِ قرآن ہی کو اپنا کیرئیر بنانے پر مجبور کر دے۔ یاد رہے کہ اس سے قبل "علاماتِ ضبط اور رسمِ قرآنی" ہی حافظ صاحب کی دلچسپی کا مرکز و محور تھے۔ انہوں نے اس موضوع پر اس قدر مواد جمع کر لیا تھا اور اپنے اندر اس کا اتنا ذوق DEVELOP کر لیا تھا کہ یہ موضوع ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا اور اب وہ اس موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھنے کے لیے مناسب فرصت کی تلاش میں تھے۔ لیکن 'ترجمۂ قرآن' کے تجربے نے ان کی سوچ کو اس حد تک بدل دیا کہ اب اول الذکر موضوع ان کے نزدیک ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اب ترجیحِ اول ان کے نزدیک 'لغات و اعرابِ قرآن' ہی کی ہے جس پر باضابطہ کام وہ شروع کر چکے ہیں اور جس کا مقدمہ شاملِ شمارہ ہے۔ تاہم 'علاماتِ ضبط اور رسمِ قرآنی' سے حافظ صاحب کے خصوصی شغف کا یہ مظہر قارئین کے سامنے آئے گا کہ "لغات و اعرابِ قرآن" میں علاماتِ ضبط کی بحث کو بھی ضمنی طور پر حافظ صاحب نے شامل کر دیا ہے۔ جس کی افادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

قارئین سے استدعا ہے کہ وہ حافظ صاحب کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس اہم تعلیمی کام کو باحسن وجوہ پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں اجرِ عظیم سے نوازے۔

ہمیں افسوس ہے کہ 'منشورِ اسلام' کی قسط اس بار بھی شاملِ اشاعت نہیں ہے۔ محترم ڈاکٹر ابصار صاحب کی طرف سے اگرچہ قسط ہمیں بروقت موصول ہو گئی تھی لیکن ادارے کے کاتب صاحب کی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے اس کی کتابت ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے۔ ان شاء اللہ فروری کے شمارے میں وہ ضرور شاملِ اشاعت ہوگی۔

ڈاکٹر اسرار احمد

دو فکری خواب اور ان کی تعبیر

ترتیب و تسوید: حافظ محمد اشرف

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ۸ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو قرآن کالج میں داخلہ پانے والے سال اوّل کے طلبہ اور ایک سالہ کورس کے شرکاء سے افتتاحی خطاب فرمایا۔ سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات، تین احادیث اور ادعیہ مسنونہ کی تلاوت کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا:

میں اس وقت قرآن کالج کی بی اے فرسٹ ایئر کلاس اور ایک سالہ کورس کے شرکاء کو خوش آمدید کہتے ہوئے حقیقی قلبی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ میری اس مسرت و خوشی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ کسی شخص نے کوئی خواب دیکھا ہو..... بڑا حسین خواب..... جو کہ بظاہر احوال ناممکن الوقوع اور محال نظر آرہا ہو، لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے اسی خواب کو عملی قالب میں ڈھلتا ہوا اور ارتقائی منازل طے کرتا ہوا دیکھے تو آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ اُسے کس قدر خوشی و مسرت حاصل ہو گی۔ میرے نزدیک زندگی میں اس سے بڑھ کر تسکین بخش کوئی اور شے نہیں۔

دو فکری خواب

میرے دو خواب تھے جو میں نے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء میں دیکھے تھے۔ یہ خواب نیند کے عالم میں نہیں بلکہ بقائمی ہوش و حواس دیکھے تھے۔ یہ دو فکری خواب تھے، جن کا تذکرہ ریکارڈ پر موجود ہے۔ یہ محض سخن سازی نہیں۔

پہلا خواب اپریل ۱۹۶۷ء میں ضبطِ تحریر میں آیا۔ مئی ۱۹۶۷ء کے "میثاق" کے شمارے میں چھپا اور عام ہوا..... جسے آج ہم "اسلام کی نشأۃِ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام" کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ اس کا مرکزی تصوّر "قرآن اکیڈمی" کے قیام پر مشتمل

ہے۔ ایک ایسا ادارہ جواُن نوجوانوں کو تربیت کے مواقع فراہم کرے جو کہ ایک طرف دولتِ ایمان ویقین سے مالا مال ہوں اور یہ ایمان ویقین محض متوارث یا موروثی نہ ہو بلکہ علیٰ وجہ البصیرت (PERSONAL CONVICTION) کے درجے کا ہو، جو فقط قرآن کے بغور مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ نوجوان جدید فکر وفلسفہ کا شعور وادراک رکھتے ہوں تاکہ قرآن وسنّت سے ماخوذ تعلیمات سے واقفیت وآگہی ان میں ایک اجتہادی بصیرت پیدا کر سکے۔ اس اجتہادی بصیرت کے دو نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اس کے ذریعے سے علم جدید کو مسلمان بنایا جاسکے گا اور دوسرے یہ کہ انسانی تمدن کے پیچیدہ اور گنجلک مسائل ومشکلات کا حل پیش کیا جاسکے گا۔

۱۹۶۸ء میں مسجد خضریٰ سمن آباد لاہور میں میرے خطباتِ جمعہ کا آغاز ہوا۔ ان خطبات کے آغاز ہی میں میں نے دو تقاریر کی تھیں، جو کہ اب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے ٹائیٹل سے چھپ رہی ہیں۔ ان میں میں نے قرآن یونیورسٹی کا تصوّر پیش کیا تھا..... ایسی یونیورسٹی کہ جس کا مرکزی شعبہ قرآن ہو۔ اس کے فہم میں ممدّ ومعاون تمام ذرائع..... عربی زبان وادب، صرف ونحو، ادب جاہلی، حدیث اور فقہ کی تعلیم وتدریس وغیرہ..... موجود ہوں تاکہ قرآن پر تفکّر وتدبّر کی راہ ہموار ہوسکے۔ باقی جملہ قدرتی، حیاتیاتی اور عمرانی علوم اس مرکز ے (NUCLEUS) کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اس مجوّزہ یونیورسٹی کے ہر طالبعلم کیلئے لازم ہو گا کہ وہ پہلے تو اس کے مرکزی شعبے..... شعبۂ قرآن..... سے کسبِ فیض کرے اس کے بعد اپنے طبعی میلان کے مطابق متعلقہ شعبۂ علم سے وابستہ ہو جائے۔ یوں قدیم وجدید علوم کا امتزاج وجود میں آئے گا اور نتیجتہً INTEGRATION OF KNOWLEDGE کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو پائے گا۔

علم بلاشبہ ایک وحدت ہے اسے توحید کی جان ویک قالب ہونا چاہئے۔ بدقسمتی سے اس وقت یہ ثنویّت و تثلیث میں بٹ چکا ہے۔ اس کی توحیدی شان بحال کرنے کا فقط یہی راستہ ہے کہ

تمام اسلامی ممالک اس طرز کی یونیورسٹیاں جا بجا قائم کریں اور استعدادات و صلاحیتوں کو ذرائع ووسائل کے ساتھ مجتمع کریں، تاکہ انتشارِ علمی کا ازالہ ہو اور وحدتِ علمی کا بول بالا ہو۔

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام

یہی دو خواب تھے جو کہ میں نے ۱۹۶۷ء اور ۱۹۶۸ء میں دیکھے تھے۔ ان کی عملی تعبیر کے حصول کیلئے میں نے جو بھی کوششیں کیں، ان کی ایک طویل داستان ہے۔ انہی کے نتیجہ میں بفضلہٖ تعالیٰ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور میرے ہم خیال و ہمدرد لوگوں کا ایک باقاعدہ حلقہ وجود میں آیا جو کہ ان بیس احباب پر مشتمل تھا جو میری فکر و امنگ اور میرے ارادوں اور عزائم سے بخوبی آگاہ بھی تھے اور شریکِ کار بھی۔ ایک لاکھ روپے کے سرمایہ سے انجمن کا آغاز ہوا۔ ایک مخیر شخصیت نے ماڈل ٹاؤن کے بی بلاک میں اپنا پلاٹ اس کارِ خیر کیلئے وقف کیا، جسے ان کی اجازت سے بیچ کر موجودہ پلاٹ..... جو نسبتاً کم قیمت بھی تھا اور پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس کے قریب ترین بھی..... خریدا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں اس پر قرآن اکیڈیمی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ بحمد اللہ تعالیٰ ایک ہی سال کے عرصہ میں انجمن کے دفاتر ۱۲ افغانی روڈ، سمن آباد سے یہاں منتقل ہو گئے اور یوں وہ تحریک..... جو ابھی تلک صفحۂ قرطاس پر موجود تھی اور کتابوں میں بند تھی، منصۂ شہود پر آ گئی اور اس نے زمین میں اپنی جڑ پکڑ لی۔

ہم نے اس فکر کی ترویج و اشاعت کیلئے مختلف سکیموں کا آغاز کیا جن کی تفصیل بالاختصار درج ذیل ہے۔

۱۔ قریبی کالجوں اور یونیورسٹی کے چند طالبعلموں کو اپنے یہاں دارالمقامہ میں رہائش فراہم کی۔ ایک طرف ان کی دینی تربیت کا اہتمام کیا تو دوسری طرف ان کیلئے عربی وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ جناب حافظ خالد محمود خضر اسی سکیم کی پیداوار ہیں۔

۲۔ آٹھویں جماعت پاس بچوں کو علومِ دینیہ سے روشناس کرانے اور میٹرک کی سطح پر تعلیم دلانے کی سکیم شروع کی جو کہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی۔

۳۔ کچھ عرصہ بعد ہم نے "قرآن اکیڈمی فیلوشپ سکیم" کا اجراء کیا۔ اس سکیم کے تحت ایسے نوجوانوں کی خدمات حاصل کرنا اور ان کی صلاحیتوں کو مجتمع کرنا مطلوب تھا جو کہ ایم اے/ایم ایس سی کر چکے ہوں یا پیشہ ورانہ تعلیم ایم بی بی ایس یا ایل ایل بی وغیرہ سے فراغت پا چکے ہوں۔ ان سے اپنی پوری زندگی اس کارِ خیر کیلئے وقف کرنے کا عہد لیا گیا، جبکہ

ان کی معاشی گاڑی کو رواں رکھنے کیلئے سرکاری تنخواہوں کا بنیادی گریڈ نمبر ۱۷ بمعہ مروّجہ اضافی فوائد انہیں دینے کا وعدہ کیا گیا' البتہ ان پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ اپنے فارغ اوقات کو کسی منفعت بخش کام کیلئے استعمال نہیں کر سکیں گے۔ دو تین سال تک انہیں تدریسی مراحل سے گزرنا ہو گا اور بعد ازاں حسب استطاعت و میلانِ طبع اس کارِ عظیم میں شریک ہونا ہو گا۔ اس کام کے چھ درجات مقرر کئے گئے جو کہ درج ذیل ہیں۔

(ا) تخلیقی شعبہ۔
(ب) تحقیقی شعبہ
(ج) دعوتی و تبلیغی شعبہ
(د) تدریسی شعبہ
(ھ) تنظیمی شعبہ
(و) انتظامی شعبہ

اس سکیم میں سات نوجوانوں نے شرکت کی' جن میں سے تین ہمہ تن و ہمہ وقت فیلوز کی حیثیت سے ہنوز اس سکیم کے ساتھ چل رہے ہیں۔

(i) حافظ محمد رفیق صاحب ایم اے اسلامیات' ایم اے عربی۔
(ii) حافظ خالد محمود خضر صاحب ایم ایس سی جیالوجی
(iii) ڈاکٹر عارف رشید صاحب ایم بی بی ایس

یہ تینوں صاحبان تین سالہ کورس مکمل کرنے کے بعد سے اپنی تمام صلاحیتیں ادارے کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔

۴۔ "دو سالہ کورس" کی سکیم کا آغاز ۱۹۸۴ء میں کیا گیا۔ اس سے استفادہ کی بنیادی شرط ایم اے/ایم ایس سی اور بی اے/بی ایس سی مقرر کی گئی۔ ایف اے/ایف ایس سی یا مساوی تعلیم کے چند خواہشمند نوجوانوں کو بھی اس میں داخلہ دیا گیا۔ انہیں بالترتیب -/۱۰۰۰ روپے' -/۸۰۰ روپے اور -/۶۰۰ روپے ماہانہ وظائف دیئے گئے تاکہ وہ اپنے والدین پر بوجھ بنے بغیر یہاں خود کفیل ہو کر رہیں۔

بحمداللہ تعالیٰ اس سکیم سے ۵۰ سے زائد نوجوان استفادہ کر کے فارغ ہوئے ہیں اور ملک

کے مختلف مقامات پر دعوتی و تبلیغی کام میں مصروفِ عمل ہیں۔

۵۔ **قرآن کالج کی سکیم** پر عمل درآمد گزشتہ سال سے شروع کیا گیا ہے۔ انٹرمیڈیٹ پاس نوجوان کو اس کالج میں داخلہ دیا جاتا ہے اور اسے تین سال میں بی اے کرایا جاتا ہے۔ ایک سال جو اضافی لیا جاتا ہے وہ تجوید، عربی گرامر، فارسی اور دیگر علوم دینیہ کی تحصیل میں صرف کیا جاتا ہے۔ یہی وہ سکیم ہے کہ جس میں آپ لوگوں نے داخلہ لیا ہے۔ اس وقت کالج میں دو کلاسیں..... سال اوّل و سال دوم چل رہی ہیں۔

۶۔ **ایک سالہ کورس کا اجرا**..... قرآن کالج کے منصوبے کے آغاز کے بعد دو سالہ کورس کے خاتمے کا فیصلہ اصولی طور پر ہو ہی چکا تھا لیکن بعض احباب کے پرزور اصرار پر اس کورس کو مختصر کر کے "ایک سالہ کورس" کے طور پر اسی سال شروع کیا گیا ہے جس میں بفضلہٖ تعالیٰ ہماری توقعات سے بڑھ کر نوجوان شرکت کر رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ اب تک ہم قرآن اکیڈمی سے قرآن کالج تک کا سفر طے کر چکے ہیں اور خدا کے فضل و رحمت سے بعید نہیں کہ وہ اس نوزائیدہ و نونہال پودے کو برگ و بار عطا فرما دے اور قرآن کالج قرآن یونیورسٹی کا درجہ حاصل کر لے۔ یہی وہ دوسرا خواب ہے جو مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق نامی کتابچے میں مذکور ہوا ہے۔ گویا قرآن کالج قرآن یونیورسٹی ہی کی تمہید ہے۔ بقول شاعر ؎

نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھتے ہیں ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھتے ہیں

یاد رہے کہ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے کہ آج کے بڑے بڑے ادارے اور یونیورسٹیاں اپنے نقطۂ آغاز میں ایک حقیر اور معمولی اداروں سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتی تھیں، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر حقیر ابتداء ایک عظیم انتہاء تک رسائی حاصل کر لے۔ البتہ کوشش جاری رہنی چاہئے کہ السَّعْیُ مِنَّا وَ الْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہ یعنی کوشش ہماری طرف سے ہے اور اس کا نشانے پر بیٹھنا فقط اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ کسی انسان کی مقدرت میں ہے ہی نہیں کہ وہ اپنے عزائم اور ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لے بجز اس کے کہ اللہ کا فضل شاملِ حال ہو جائے۔

پس یہی میرے دو خواب تھے جن پر عملی پیش رفت درجہ بدرجہ ہو رہی ہے اور اگر اللہ

نے چاہا تو یہی پودا ایک دن بار آور درخت بنے گا۔

اس فکری پس منظر کی مختصر سوانح حیات..... متذکرہ صدر سطور میں تو میں نے آپ لوگوں کو اپنے اس فکر کے پس منظر سے آگاہ کیا۔ آیئے اب ذرا ع "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو" کے مصداق اس فکری پس منظر کا کھوج لگائیں۔

برعظیم پاک و ہند..... جس کے تین آزاد و خود مختار ٹکڑے دنیا کے نقشے پر ظاہر ہو چکے ہیں، میں مسلمانوں کی کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت قائم رہی۔ آخری دو سو سال انتشار و انحطاط کی نذر ہوئے بالآخر ۱۸۵۷ء میں مغربی نو آبادکاروں کے ہاتھوں اس حکومت کی بساط لپیٹ دی گئی۔

متحدہ ہندوستان میں مغربی اقوام کی آمد کا سلسلہ ۱۴۹۸ء میں شروع ہوا جبکہ واسکوڈے گاما نے "سونے کی اس چڑیا" تک رسائی کا بحری راستہ تلاش کر لیا۔ ۱۶ویں اور ۱۷ویں صدی عیسوی تک ان لوگوں کی آمد و رفت ساحلی شہروں تک محدود رہی اور تجارت ان کی تمام سرگرمیوں کا محور رہی۔ اٹھارویں صدی میں انہوں نے بال و پر نکالنے شروع کئے اور اپنے عسکری تسلّط کی بنا ڈالی۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدّولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۹۹ء میں میسور کو اپنے زیر نگیں کیا اور اپنی سازباز اور شاطرانہ چالوں اور عسکری تغلّب کے نتیجے میں وہ ۱۸۵۷ء میں پورے ہندوستان پر چھا گئے۔

انگریز کے یہاں قابض ہونے کے ساتھ ہی انگریزی زبان و ادب، علم و فکر اور تہذیب و تمدن بھی در آئے۔ اس واقعی صورت حال نے مسلمانانِ پاک و ہند کو ایک نئے مسئلے سے دوچار کر دیا جس کی بابت مسلمان قیادت کی دو آراء نکھر کر سامنے آ گئیں۔ ایک طبقہ علماء کا طرزِ عمل ترکِ موالات یا عدمِ تعاون پر مبنی تھا۔ انہوں نے انگریزی زبان سیکھنے، انگریزی علوم پڑھنے اور انگریزی راہ و رسم اور طرزِ معاشرت اپنانے کی شدید مخالفت کی۔ علماء کے دوسرے طبقے کی رائے اس کے برعکس تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریز آ چکا اور اس کا تسلط چھا چکا۔ ہم اسے ذہناً قبول کریں نہ کریں، عالمِ واقعہ میں تو وہ موجود ہے لہٰذا حال کے اندیشوں اور مستقبل کے خدشات کے پیشِ نظر "ترکِ موالات" کی حکمت عملی اختیار کرنے کی بجائے تعاون کی راہ اختیار کی جائے۔ انگریزی علوم و فنون اور سائنسی تحقیقات سے استفادہ کیا جائے اور خُذ

ماصفادَع ما کدر کے اصول پر خلافِ اسلام چیز کو مسترد کر دیا جائے۔

فکر کے ان دو دھاروں کی کوکھ سے دو عظیم درسگاہوں نے جنم لیا ایک دار العلوم دیوبند اور دوسرا محمڈن اینگلو انڈین کالج علی گڑھ۔ یہ دونوں ادارے دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے مظہر تھے۔ دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل علماء اکثر و بیشتر علومِ جدیدہ سے بے بہرہ اور عالمِ واقعہ سے لاتعلق تھے، جبکہ علی گڑھ کالج نے ایسے "مسٹر" پیدا کئے جو کہ اپنی دینی اقدار اور افکار و نظریات کے بارے میں تشکیک و تردّد میں مبتلا ہوئے۔ یوں ان کا دین سے رابطہ برائے نام رہ گیا۔

ان دو متضاد دھاروں کو یکجا کرنے کے لئے تین عظیم شخصیات نے تین خواب دیکھے جن کی تفصیل درج ذیل ہے

۱۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ مسلمانوں کے درمیان اس "نو طبقاتی تقسیم" پر سخت فکر مند تھے۔ اپنی شدید علالت کے باوجود ۱۹۱۹ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے اور وہاں اپنے اس درد کو زبان دی۔ ایک مشترکہ کوشش کا نتیجہ "جامعہ ملّیہ" کی شکل میں بر آمد ہوا جو علی گڑھ میں قائم ہوا اور بعد میں دہلی منتقل ہو گیا۔ اس ادارے کی اصل غرض و غایت دیوبند اور علی گڑھ کو قریب تر لانا اور یکجا کرنا تھی۔

اسی طرح کا ایک ادارہ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دہلی میں نضارۃ معارف الاسلامیہ کے نام سے قائم کیا۔ اس کا مقصدِ وحید قرآن مجید کو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے قلوب و اذہان میں اتارنا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ میں "دار الارشاد" قائم کیا۔ مقصود پیش نظر یہ تھا کہ ایسے نوجوان مبلّغین تیار کئے جائیں جو کہ قرآن کے فکر و استدلال سے بخوبی آگاہ ہوں۔ وہ ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل کر مسلمانوں کے اندر تجدیدِ ایمان اور احیائے دین کی تحریک برپا کر سکیں۔

ان تینوں اداروں نے زمین پر اپنی بناء تو ڈالی لیکن وہ یا تو اپنے مئو سّسین کی دیگر مصروفیات کے باعث جلد ہی درجۂ معدوم کو پہنچ گئے یا پھر رسمی کارروائی بن کر رہ گئے۔ نضارۃ معارف الاسلامیہ مولانا سندھیؒ کی افغانستان کو ہجرت کے باعث بند ہو گیا۔ دار الارشاد مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات کی بھینٹ چڑھا اور جامعہ ملّیہ ایک عام روایتی

یونیورسٹی بن کر رہ گیا۔ یہ ادارہ اب تک دہلی میں قائم ہے۔

دوسرا خواب علامہ اقبال نے دیکھا تھا جو کہ خواب کے درجے میں ہی رہا۔ ادارے کا ڈھانچہ تو کھڑا ہو گیا لیکن اس میں فکر کی تخم ریزی نہ ہو سکی۔ حضرت علامہ نے ایک عقیدت مند چودھری نیاز علی خان کو ایک ایسے ادارے کے قیام کا تصور دیا جو کہ مسلمان گریجویٹس کو قرآن پڑھائے اور فکر و اسرارِ قرآنی سے آشنا کرے تاکہ جسد ملّی کی تقسیم کو روکا جا سکے۔ موصوف نے اپنے ہی فنڈز سے اپنے ایک قطعۂ اراضی پر مجوزہ ادارے کے لئے عمارت تعمیر کر دی۔ اور حضرت علامہ کو آگاہ کر دیا۔

علامہ اقبال نے الازہر یونیورسٹی مصر کے ریکٹر سے ایک ایسے جدید تعلیم یافتہ عالم دین کو ہندوستان بھیجنے کی فرمائش کی جو انگریزی زبان میں جدید ذہن کو قرآن کی تعلیم دے سکے اور اسے مطمئن کر سکے۔ لیکن وہاں سے معذرت آ گئی۔ اس پر حضرت علامہ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو..... جو اس وقت حیدر آباد دکن میں مقیم تھے..... مشورہ دیا کہ وہ متذکرہ ادارے میں منتقل ہوں اور احیائے دین کا جو کام کرنا چاہتے ہیں یہاں رہ کر کریں۔ لیکن مولانا کی وہاں منتقلی تک حضرت علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا۔ یوں یہ خواب عملی تعبیر کے قالب میں نہ ڈھل سکا۔ البتہ یہ "دارالاسلام ٹرسٹ" جماعت اسلامی کے مرکز میں تبدیل ہو گیا جو تقسیم ہند تک قائم رہا۔

میرا یہ فکری خواب درحقیقت انہی متذکرہ صدر خوابوں کا تسلسل ہے جو کہ قرآن اکیڈمی سے شروع ہو کر قرآن کالج کی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے تدریجاً قرآن یونیورسٹی کی منزل کی طرف پھیل رہا ہے۔ اس سفر کی جزئیات پر پہلے کلام ہو چکا ہے۔

وقت کا اہم ترین چیلنج..... اس وقت ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ایک مادّہ پرست تہذیب پورے گلوب پر مسلّط ہے۔ یہ تہذیب یورپ میں مذہب سے بیزاری بلکہ بغاوت کے تخم سے پیدا ہوئی، سائنٹفک حقائق و شواہد نے اسے پروان چڑھایا، مشین کی ایجاد نے اسے تقویت بخشی اور معاشی مفادات و مصالح اور سیاسی تغلّب نے اسے پوری دنیا پر غالب کر دیا۔ مسلمان ہونے کے ناطے اب ہمیں اسلام کو ایک زندہ قوت کے طور پر منوانا ہے، اس کے افکار و نظریات کو عام کرنا ہے اور جدید بے خدا اور مادہ پرستانہ افکار و آراء کا ابطال کرنا ہے، تاکہ

ایک طرف دین کو فروغ حاصل ہو اور وہ بطور ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے برپا ہو سکے تو دوسری طرف "چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر" کی حامل جدید تہذیب کی قلعی کھل سکے۔

اس چیلنج سے نمٹنے کے لئے لازم ہے کہ

ا۔ علم کی تقسیم کو ختم کر کے اسے وحدت کے رنگ میں رنگا جائے۔

ب۔ ایمان اور علم کے رشتے کو باہم مضبوطی سے جوڑ دیا جائے۔

ج۔ ایک ایسی دینی، سیاسی اور عوامی تحریک برپا کی جائے جو ٹھوس بنیادوں پر یہ وقیع کام کر سکے اور جس کا مدار جذبات ابھارنے سے زیادہ استدلال پر ہو۔ ہم نے اپنی حدِ استطاعت تک یہ کام کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کا داعیہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ قرآن اکیڈمی، قرآن کالج اور قرآن یونیورسٹی اسی فکر و فلسفہ کے اہم ترین سنگ ہائے میل ہیں اور آپ لوگ بہر طور اسی فکر و فلسفہ سے شعور و آگہی حاصل کر کے بحمد اللہ تعالیٰ یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اس افتتاحی موقع پر میں نے یہ تفصیلات آپ کے گوش گزار اس لئے کی ہیں کہ آپ سنگ و خشت سے بنی ہوئی اس عمارت کو اور یہاں رائج تدریسی نظام کو محض روایتی خیال نہ کریں بلکہ ان کی مقصدیت ہمیشہ آپ کے پیشِ نظر رہے۔

شرکاء کا مطلوب طرزِ عمل..... آپ لوگ جس کام کا آغاز کر رہے ہیں اس کے ضمن میں چند احادیث کی مدد سے آپ کے طرزِ عمل کی بابت کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں جنہیں آپ کو اپنے ذہن میں جاگزیں اور اپنے عمل میں جذب کرنا ہو گا جو کہ درج ذیل ہیں۔

سب سے پہلی شرط کہ جس کے ذریعے سے آپ اس کام میں پیش رفت کر سکتے ہیں، اخلاصِ نیت ہے۔ آپ یہاں کے تعلیمی ماحول سے استفادہ کے لئے دور دراز سے چل کر آئے ہیں۔ آپ کے گرد و نواح میں تعلیمی سہولتوں کی کمی نہ تھی، لیکن آپ اس فکر کی آبیاری اور اس تصوّر کی پختگی کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جو آپ نے یا آپ کے والدین نے حق جانا۔ پس چاہئے کہ آپ اسے محض دنیوی تعلیم پر محمول نہ کریں ورنہ پہلا قدم ہی غلط ہو جائے گا۔ چنانچہ نیت کی اصلاح بہت ضروری ہے اور نیت یہ ہو کہ ہمیں اپنے آپ کو اللہ کے دین کے فہم و عمل، اشاعت و تبلیغ اور تنفیذ و اقامت کے لئے تیار کرنا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے روایت مرسل حدیث جو میں نے آغاز کلام پر آپ کو سنائی تھی

اس کا یہی مفہوم ہے۔ نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ جَاءَهُ الْمَوْتُ وَهُوَ يَطْلُبُ الْعِلْمَ لِيُحْيِيَ بِهِ الْاِسْلَامَ فَبَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّبِيِّيْنَ دَرَجَةٌ وَّاحِدَةٌ فِي الْجَنَّةِ (دارمیؒ)

ترجمہ۔ "جس شخص کی موت آگئی اس حالت میں کہ وہ احیائے اسلام کے لئے علم حاصل کرنے میں مصروف تھا (اگرچہ ابھی تک اس نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی نہ کیا تھا) تو جنت میں اس کے اور انبیاء علیہم السلام کے مقامات و درجات میں ایک درجہ کا فرق ہوگا۔"

پس واضح ہوا کہ احیائے دین کے لئے جدوجہد کی اولین کلید حصولِ علم ہے اور یہ منقسم علم نہیں جو کہ دنیا و دین کو باہم ٹکرا اور الجھا دے بلکہ وہ علم ہے جو ان دونوں کو وحدت کے قالب میں ڈھال دے۔ چنانچہ نیت و ارادہ کے پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ حصولِ علم کی جدوجہد میں یوں منہمک ہونا کہ ایک طرف خود علم مسلمان ہوتا جائے اور دوسری طرف وہ آپ کے قلب و ذہن میں اترتا اور نفوذ کرتا چلا جائے۔

چنانچہ آپ لوگ اس کا اہتمام پورے شدومد سے کریں کہ قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج میں آپ کا جو بھی وقت گزرے وہ حصولِ علم برائے احیائے اسلام کی نیت سے گزرے۔ اور حضورؐ کے ارشاد کے بموجب یہ کتنی بڑی خوشخبری اور نوید جانفزا ہے کہ وہ طالب علم جو حصولِ علم کی اس جدوجہد کو لیحیی بہ الاسلام کے لئے خاص کر دے، اللہ کے یہاں مقامِ صدّیقیت کا مستحق گردانا جائے گا اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے ان تمام لوگوں کے لئے کہ جو شعوری طور پر اس کام کا فیصلہ کر چکے ہوں اور جنہوں نے کامل خلوص و اخلاص سے اس پگڈنڈی پر سفر شروع کر دیا ہو اور وہ فی الواقع اسلام کو دنیا میں ایک زندہ قوت بنانا اور دیکھنا چاہتے ہوں۔ اس راستے میں اگر ان کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور موت انہیں آن لے تو اللہ کے یہاں وہ اپنا اجر و ثواب محفوظ پائیں گے۔

متذکرہ صدر حدیث جہاں نیت کے اخلاص پر دلالت کر رہی ہے وہاں ایک اور حدیث جو حضرت عثمانؓ سے مروی ہے اور متفق علیہ ہے اسی کام کے عملی پہلو کو متعیّن کر رہی ہے۔ جناب رسالت مآبؐ کا فرمان ہے خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ یعنی تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں۔ یہ قرآن اکیڈمی، قرآن کالج اور انشاءاللہ قرآن یونیورسٹی..... یہ سب تعلیم قرآن ہی کے رائج ہیں۔ وقت کا شدید ترین

تقاضا اور اہم ترین چیلنج ہے کہ

۱۔ ہم قرآن میں موجود فلسفہ و حکمت کے موتیوں کی کھوج کرید کریں اور انہیں اعلیٰ ترین علمی سطح پر معاشرے کی ذہین اقلیت کے سامنے پورے دلائل و براہین کے ساتھ پیش کریں تاکہ اس کے قلب و ذہن پر الحاد، مادّہ پرستی اور ظواہر و شواہد کا میل کچیل چھٹ جائے اور وہ اپنے شفاف آئینہ قلب اور لوحِ ذہن کے ساتھ قرآن میں غوطہ زنی کے لئے آمادہ و تیار ہو جائے۔ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پوری دنیائے انسانیت کے روبرو اسلام کی حقانیت آشکار کریں۔ اسے درپیش جملہ مسائل کا خدائی حل پیش کریں اور یوں شہادت علی الناس کا فریضہ علمی سطح پر ادا کرنے کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیں۔

۲۔ عامۃ الناس کو اس کے مواعظ حسنہ کی مدد سے نورِ ایمان اور دولتِ یقین سے مالا مال کریں تاکہ ایک عوامی تحریک برپا ہو جو کہ انقلابِ اسلامی کے لئے پیش خیمہ بنے۔

۳۔ نورِ قرآن سے باطل افکار و نظریات کا رد پیش کریں تاکہ خدا کی یہ بستی..... دنیائے انسانیت..... ان کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو تعلیم و تعلّم قرآن کے یہی وہ مقتضیات ہیں جو ہماری سربسر توجہ کے مستحق ہیں۔

جہاں تک قرآن کالج کے طلباء اور ایک سالہ کورس کے شرکاء کے لئے تعلیمی نصاب کا تعلق ہے تو اس میں ہم نے علمِ تجوید کے بنیادی قواعد بھی شامل کئے ہیں۔ علم تجوید حروف و مخارج کی پہچان کراتا ہے، ان کی ادائیگی کا طریق سکھاتا ہے جس کے نتیجے میں ہم قرآن کو پوری طرح صحتِ لفظی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں جو صحیح طور پر قرآن کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔ چنانچہ آپ تلاوتِ قرآن کی تصحیح کے لئے "ا۔ ب۔ ت" سے آغاز کرنے میں عار بالکل محسوس نہ کریں۔ پس تجوید سے لے کر عربی صرف و نحو، فارسی، ترجمۃ القرآن اور اس میں تفکّر و تدبّر..... یہاں تک کہ اسے اعلیٰ ترین فلسفیانہ سطح پر پڑھنا اور پڑھانا "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَ عَلَّمَهٗ" کے جامع عنوان کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہماری کوشش بھی ہے اور خواہش بھی کہ آپ لوگوں میں متذکرہ صدر ہر سطح کے لئے ایک داعیہ بیدار کر دیں تاکہ آپ حسبِ استطاعت فہمِ قرآن کے کسی درجے کو منتخب کر سکیں اور اپنی صلاحیتوں کو اس کے اندر کھپا سکیں۔

تیسری اور آخری حدیث جو میں نے آپ کو سنائی تھی وہ حضرت امیر معاویہؓ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے۔ اس میں حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے۔ مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ "جس فرد پر اللہ تعالیٰ اپنا خاص فضل و رحمت فرمانا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔" اس حدیث کی وضاحت کے لئے ضروری ہے کہ آپ یہاں علم اور فہم کا فرق سمجھ لیں۔

علم سے مراد معلومات کا وہ ذخیرہ یا مجموعہ ہے جو انسان کسی بھی معاملے کی بابت جمع کرتا ہے اور فہم وہ قوت ہے جو ان معلومات کو باہم مربوط کر کے کسی نتیجے تک پہنچاتی ہے اور کسی رائے، فکر، فلسفہ یا نظریئے کو جنم دیتی ہے۔ تفقّہ فی الدین کا مفہوم یہی ہے کہ احکاماتِ شرعیہ کی غرض و غایت، ان میں حکمت و دانائی کی کھوج کرید، ان پر غور و فکر کے لئے اصول و مبادی کی تشکیل و ترتیب اور پھر خاموش معاملات کی بابت رائے زنی کا طریق..... پس معلوم ہوا کہ علم اور فہم دو الگ الگ قوتیں ہیں۔ جس فرد میں یہ دونوں یکجا ہو جاتی ہیں وہ تو گویا خیرِ کثیر سے نوازا جاتا ہے۔ بفحوائے آیتِ قرآنی۔

مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا (البقرہ)

عین ممکن ہے ایک فرد کے پاس معلومات کا ایک مبسوط ذخیرہ ہو اور اس کا ذہن ایک کتاب خانہ ہو، لیکن وہ فہم و تفقّہ سے عاری ہو۔ ایسا علم بجائے خود ایک مہمل سی شے بن کر رہ جائے گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے کے ساتھ خصوصی خیر و بھلائی اور فضل و انعام چاہتا ہے اسے دین کا فہم عطا کر دیتا ہے۔

تفقّہ فی الدّین کا اہم ترین پہلو کہ جس سے آپ اپنی اپنی جماعتوں میں "منتخب نصاب" کے حوالے سے تعارف حاصل کریں گے تصوّرِ دین کی وضاحت اور فرائضِ دینی کا شعور و آگہی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ دین کیا ہے، یہ ہم سے کیا چاہتا ہے، اس کے احکامات کیا ہیں اور ان میں کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں اور پھر آپ یہ بھی جانیں گے کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح محض چند عبادات کے مجموعے یا رسومات کے طومار کا نام نہیں، بلکہ اس میں ایک پورا نظامِ فکر بھی ہے اور نظامِ حیات بھی۔ گویا فکر و عمل میں اس کا اپنا منفرد اور جداگانہ ڈسپلن موجود ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسانی زندگی فکر و عمل کے مجموعے کا نام ہے۔ فکر

صحیح ہو تو عمل بھی درست ہو گا۔ ورنہ محدود فکر محدود عمل پر منتج ہو گا۔ اسلام اسی لئے اپنے ماننے والوں کے یہاں "فکر و عمل" کی وحدت دیکھنا چاہتا ہے جو کہ انفرادیت سے لے کر اجتماعیت کی تمام سطحوں پر محیط ہو۔

میں اپنی گزارشات کا اختتام اس دعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ اللہ عزّ و جلّ ہماری ان کوششوں کو مؤثّر بنائے، ہمیں ان ارادوں میں کامیاب کرے، تحصیلِ علم میں اخلاصِ نیت سے متصّف فرمائے اور میدانِ عمل میں استقامت و مداومت علی الخیر سے نوازے۔ آمین۔

DR. ISRAR AHMED'S LECTURES

in English Language are available on the following topics in

Video Cassettes:

	Topics	Qty.
1.	Meaning of Iman	2
2.	Process of an Islamic Revolution	3
3.	The duties of a Muslim	2
4.	General Question & Answers	1

Rate: One Video Cassette: Rs. 175/-

Available with:
Maktaba Markazi Anjuman Khuddamul Quran
36-K, Model Town, Lahore.
Phone: 856003 856004

Anjuman Khuddamul Quran Sind
11-Dawood Manzil Sharah-e-Liaqat,
Near Aarm Bagh, Karachi.
Phone: 216586

S.S.Q. Greater Chicago
810, 73rd Street Downers Grove
IL 60516 USA.
Ph: 312-969-6755

کوپن برائے سالانہ خریداری

میں ماہنامہ ”حکمتِ قرآن“ لاہور کا سالانہ خریدار
بننا چاہتا ہوں / چاہتی ہوں ——— میری طرف سے سالانہ
زرِ تعاون مبلغ -/۴۰ روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ
ارسالِ خدمت ہیں / مجھے ماہ ——— کا شمارہ -/۴۴ روپے کی وی پی
کی شکل میں درج ذیل پتے پر ارسال کر دیجئے۔

نام --

پتہ --

نوٹ: رقم ماہنامہ حکمت قرآن ’۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتے پر ارسال کی جائے

کوپن برائے سالانہ خریداری

میں ماہنامہ ”حکمتِ قرآن“ لاہور کا سالانہ خریدار
بننا چاہتا ہوں / چاہتی ہوں ——— میری طرف سے سالانہ
زرِ تعاون مبلغ -/۴۰ روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ
ارسالِ خدمت ہیں / مجھے ماہ ——— کا شمارہ -/۴۴ روپے کی وی پی
کی شکل میں درج ذیل پتے پر ارسال کر دیجئے۔

نام --

پتہ --

نوٹ: رقم ماہنامہ حکمت قرآن ’۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن لاہور کے پتے پر ارسال کی جائے

عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا
فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (البقرة: ۱۱۴، ۱۱۵)

جوابی کاروباری سروس۔ پرمٹ نمبر ۱۳۱۹

اندرون پاکستان
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
لاہور۔ ۵۴۷۰۰
پاکستان

جوابی کاروباری سروس۔ پرمٹ نمبر ۱۳۱۹

اندرون پاکستان
ٹکٹ لگانے کی
ضرورت نہیں

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن
لاہور۔ ۵۴۷۰۰
پاکستان

Phone: 216586

S.S.Q. Greater Chicago
810, 73rd Street Downers Grove
IL 60516 USA.
Ph: 312-969-6755

(۲۸)

مولانا محمد تقی امینی

تنگ نظری عبادت گاہوں اور مسجدوں تک کو ویران کر دیتی ہے

تنگ نظری کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر قوم گراوٹ و پستی کے وقت اس میں مبتلا ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات میں مسلک کا اختلاف ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرقہ و گروہ وجود میں آجاتا ہے جس کی بنا پر عبادت گاہیں اور مسجدیں الگ الگ ہوتی ہیں اور اگر ایک ہی رہتی ہیں تو ان میں لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا ہے پھر ہر فرقہ و گروہ اپنے کو اللہ سے قریب جانتا ہے اور ہر ایک اپنے کو تنہا جنت کا مستحق سمجھتا ہے۔ کبھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اللہ کی اتنی لمبی چوڑی جنت و رحمت اس کے لئے کیسے خاص ہو جائے گی اور اللہ اپنے دوسرے بندوں کو کیونکر محروم کر دے گا۔؟ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے دعا کی کہ بارالہا میری قوم سے سب کچھ لے لینا لیکن عقل نہ لینا۔ ارشاد ہوا کہ "جب مجھے کسی قوم سے کچھ لینا ہوتا ہے تو پہلے اس کی عقل ہی کو لیتا ہوں"۔ گراوٹ و پستی کے زمانہ کی بے عقلی و تنگ نظری کے واقعات سے قوموں کی تاریخ بھری ہوئی ہے جس کی طرف آیتوں میں اشارہ ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۱۱۴، ۱۱۵)

"اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روک دیا اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کی[۱]۔ ایسے لوگوں کو ان میں داخل ہونے کا کوئی حق نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ سے ڈرتے ہوئے داخل ہوں ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے[۲]۔ اور اللہ ہی کا مشرق بھی ہے اور مغرب بھی ہے تم جدھر رُخ کرو اللہ ہی کا رُخ ہے بے شک اللہ وسعت والا جاننے والا ہے۔"

۱ قرآن کا انداز بیان یہ ہے کہ وہ صرف کسی حقیقت کو ذہن نشین نہیں کرتا بلکہ اس کے ثبوت کے لئے واقعات کا ذکر کرتا ہے یا ان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں یہود و نصاریٰ کے ان واقعات کی طرف اشارہ ہے جو بیت المقدس اور اس سے باہر عبادت گاہوں میں ایک دوسرے کو اللہ کا ذکر کرنے اور اس کی عبادت سے روکنے سے تعلق رکھتے ہیں جن سے فساد خونریزی تک نوبت پہنچتی اور اللہ کی مسجدیں ویران و برباد ہوتی تھیں۔ تاریخ میں یہ واقعات مشہور رہے ہیں۔

۲ یہ مسجدوں اور عبادت گاہوں کی عظمت اور ان کے مقدس ہونے کا ذکر ہے کہ ان میں تو عجز و نیازمندی کی گردن جھکائے اللہ سے ڈرتے ہوئے داخل ہونا چاہیئے نہ کہ شر و فساد پھیلاتے ہوئے داخل ہوں۔ ایسے لوگوں کی سزا دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

۳ یہود و نصاریٰ میں جھگڑے کی ابتدا قبلہ کی سمت سے ہوئی۔ بیت المقدس دونوں کا قبلہ تھا اس میں مشرقی سمت اور مغربی سمت کا کوئی سوال نہ تھا لیکن نصاریٰ نے اس کی مشرقی سمت کو قبلہ کے لئے منتخب کر لیا اور اس کی ضد میں یہودیوں نے اس کی مغربی سمت کو منتخب کیا۔ نصاریٰ نے یہ انتخاب غالباً اس بنا پر کیا ہوگا کہ حضرت مریمؑ نے بیت المقدس کے اس حصہ میں اعتکاف کیا تھا جو مشرقی سمت میں تھا اور جس کی بنا پر ان کے نزدیک اس کو خصوصیت حاصل ہوگئی تھی۔ ابتداء تو اس اندر کے اختلاف سے ہوئی لیکن بعد میں اس اختلاف سے اندر و باہر کوئی جگہ محفوظ نہ رہ سکی اور اس مشرق و مغرب کو بنیاد بنا کر آپس میں خوب جنگیں ہوتی رہیں۔ آیت میں بتایا گیا ہے کہ بیت المقدس کی مشرق و مغرب دونوں سمتیں اللہ کی ہیں۔ اس کو قبلہ بنا کر جس سمت کی جانب رخ کرو گے اللہ ہی کی طرف رخ ہوگا۔ وہ کسی سمت میں محدود نہیں ہے بلکہ وہ بہت

وسعت والا اور باخبر ہے۔ تنگ نظری و تنگی نہ اس میں ہے اور نہ اس کے کسی حکم میں ہے بلکہ لوگوں کے دلوں میں ہے گراوٹ و پستی کے زمانہ میں لوگوں کے دل تنگ ہو جاتے ہیں جس سے وہ اللہ کو تنگ سمجھ لیتے اور اس کے حکم کو بھی تنگ بنا دیتے ہیں۔

تنگ نظری اللہ کو بھی اپنی سطح سے دیکھتی ہے

تنگ نظری مسجد و محراب ہی میں ہنگامہ نہیں کرتی ہے بلکہ اللہ کو بھی اپنی سطح سے دیکھتی اور طرح طرح کے مشرکانہ خیالات اور طرح طرح کے بے جا سوالات کو جنم دیتی ہے۔ اس کا خیال ہوتا ہے کہ جس طرح لوگ اپنے کام کاج میں مددگاروں اور شریکوں کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح اللہ بھی محتاج ہے اور جس طرح لوگ آل اولاد کے ضرورت مند ہوتے ہیں اسی طرح اللہ بھی ہے چنانچہ:

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ (البقرۃ: ۱۱۶ تا ۱۱۹)

"اور کہتے ہیں اللہ نے اولاد بنا رکھی ہے۔ حالانکہ وہ پاک ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے فرمانبردار ہیں وہی آسمانوں

اور زمین کو وجود میں لانے والا ہے اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے[1]۔ اور بے علم کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا ہے یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی ہے۔ ان سے پہلے لوگ بھی ایسی ہی باتیں کہہ چکے ہیں۔ ان کے دل ایک ہی جیسے ہیں[2]۔ یقین کرنے والوں کے لئے تو ہم نشانیاں بیان کر چکے ہیں۔ بے شک ہم نے آپ کو سچائی کے ساتھ خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور آپ سے دوزخیوں کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی[3]

---

[1] یہ اللہ کو اپنی ہی سطح سے دیکھنے کا نتیجہ تھا کہ یہودی حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے اور عیسائی حضرت مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے اور عرب کے مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ جبکہ اللہ کے لئے نہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ان کو اس کے لئے سوچا جا سکتا ہے۔

[2] تنگ نظری کا ذہن اور اس کا مزاج ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ پہلے اور اب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ سے ہمکلامی یا خاص نشانی کا مطالبہ جس طرح پہلے کیا گیا اب بھی کیا جا رہا ہے۔ اللہ سے ہمکلامی کا مطالبہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کا جواب دیا جائے۔ البتہ ثبوت کے لئے کچھ نشانیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ دکھائی جاتی رہی ہیں۔

[3] سب سے بڑی نشانی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے جو آفتاب کی طرح اپنے اوپر اور اپنی کہی ہوئی سچی باتوں کے اوپر خود دلیل ہے۔ اگر کسی کو یہ نشانی نظر نہیں آ رہی ہے تو اس کی آنکھ کا قصور ہے آفتاب کا نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی اور نشانی کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ پھر بھی چھوٹی چھوٹی نشانیاں دکھائی جاتی رہی ہیں۔ حق اور سچ کو ثابت کرنے کے لئے ہر کس و ناکس کی مرضی و پسند کی نشانیاں پیش کرنے سے نہ صرف حق اور سچ کا وقار گھٹتا ہے بلکہ اس کے پیش کرنے والے کی حیثیت بھی گرتی ہے۔

فرقہ پرستی و گروہ بندی میں سب لوگ یکساں نہیں ہوتے ہیں!

فرقہ پرستی و گروہ بندی کے اتنے خراب نتائج کے باوجود ان میں کام کا میدان ختم نہیں ہوتا ہے بلکہ انہیں میں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جو نیک دل ہوتے اور سچائی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ان سے حق بات قبول کرنے کی توقع ہوتی ہے۔ یہ چونکہ پورے فرقہ اور گروہ میں پھیلے ہوتے ہیں متعین طور پر معلوم نہیں ہوتے ہیں اس بناء پر سبھی میں کام کرتے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ

"اور یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک آپ ان کے دین کی پیروی نہ کریں گے[۱]۔ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک ہدایت اللہ ہی کی ہدایت ہے[۲]۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی اس کے بعد کہ آپ کے پاس (حقیقت کا) علم آچکا ہے تو اللہ کی طرف سے کوئی حمایت کرنے والا اور مددگار نہ ہوگا[۳]۔ (ہاں) وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی وہ اس کو پڑھتے ہیں اور اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہی لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور جو اس سے انکار

کریں گے وہی نقصان اٹھانے والے ہیں[۴]۔ اے بنی اسرائیل میرے انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کئے اور دنیا جہان والوں پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے گا اور نہ اس سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا۔ اور نہ اس کو کوئی سفارش فائدہ پہنچائے گی اور نہ وہ مدد دیئے جائیں گے[۵]۔

۱؎ یہ فرقہ اور گروہ کے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو ہر ایک کو اپنی ہی خواہش کے مطابق چلانا چاہتے اور ہر ایک کو اپنے ہی فرقہ اور گروہ میں داخل کرنا چاہتے ہیں باہر کی کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے حق اور سچائی کی بات قبول کرنے کی توقع نہیں ہوتی ہے۔

۲؎ اللہ کی ہدایت تو بس ایک ہی ہے جو ہمیشہ ایک رہی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے ماننے والے بدلتے رہے ہیں یہ ہدایت تمہارے پاس بھی آئی تھی لیکن تم نے اس کو باقی نہیں رکھا۔ اس بناء پر اب یہ دوسروں کے حوالہ کی گئی ہے۔

۳؎ یہ بات کسی اندیشہ کی بناء پر نہیں کہی جارہی ہے کہ خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کی خواہش کی پیروی کا اندیشہ تھا بلکہ ایک بات فرض کرکے اس کے برے انجام سے آگاہ کیا جارہا ہے جس سے یہ دکھانا اور بتانا مقصود ہے کہ رسول جیسی عظیم شخصیت بھی اگر ایسا کرے گی تو یہ بات اتنی بری ہے کہ رسول کی عظمت بھی برے انجام سے اس کو نہ بچا سکے گی۔ اور اس کو اپنے کام میں کوئی مددگار اور حمایتی نہ مل سکے گا

۴؎ یہ فرقہ اور گروہ کے ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو نیک دل اور سچے ہوتے ہیں۔ اللہ کی کتاب میں سے جو کچھ اور جس حالت میں ان کے پاس ہوتا ہے اس کو سینہ سے لگائے رہتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے ہی کام کے اور قابلِ قدر ہوتے ہیں۔ ان کی طرف توجہ کرنے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں سے حق بات قبول کرنے اور اس پر ایمان لانے کی توقع ہوتی ہے۔

۵؎ اوپر بہت دور سے بنی اسرائیل کی احسان فراموشی اور گمراہیوں کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ

چلا آرہا ہے جس سے یہ ثابت کر دیا گیا کہ اب نہ دینی قیادت و سرداری کے لائق رہ گئے ہیں اور نہ اس انعام و فضیلت کے مستحق رہ گئے ہیں جو اس راہ سے ان کو حاصل تھی ۔

یہ آخر میں نعمتوں کی یاد دہانی پھر کرائی جارہی ہے ۔ پہلے بطور "تمہید" یاد دہانی کرائی گئی تھی (ملاحظہ ہو آیت ۴۷) اب حجت تمام کر دینے کے بعد بطور اظہارِ افسوس یاد دہانی کرائی جارہی ہے کہ میں نے تو تمہارے ساتھ سب کچھ کیا لیکن تم نے خود کو اس قابل ہی نہ رکھا (جیسا کہ اوپر بیان کئے ہوئے تذکرہ و تبصرہ سے ثابت ہو چکا ہے) اب میرے لئے دینی قیادت و سرداری کی تبدیلی کے بغیر چارہ نہیں رہ گیا ہے ۔

یہ تذکرہ و تبصرہ بنی اسرائیل کی صرف گزری ہوئی باتیں نہیں ہیں بلکہ قوموں کے زوال و ان کی گراوٹ و پستی کی "داستان" ہے جس میں ہر قوم کے لئے رہنمائی ہے خاص طور سے مسلمانوں کو اس سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیئے کہ بنی اسرائیل کے بعد انہیں کو دینی قیادت و سرداری کے لئے منتخب کیا گیا تھا اب وہ اس سے کتنے دور ہو گئے ہیں اور ان میں کس کس طرح وہی باتیں سرایت کر گئی ہیں جو بنی اسرائیل کی محرومی کا سبب بنی تھیں ۔

(جاری ہے)

بقیہ: تبصرۂ کتب

عشیر ان کو میسر نہ آیا جو اس کے درپے رہے ۔ یہ کتاب اس دعوی کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔ آپ دیکھیں گے کہ اپنے وقت کے کتنے بڑے لوگ اختلاف فکر و نظر کے باوجود ابوالکلام کی بارگاہ میں کس طرح خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے حوالہ سے پاکستانی ابوالکلامیوں ہی نہیں ہر ذوقِ سلیم رکھنے والے انسان کے لیے یہ کتاب عظیم تحفہ ہے جس کی ظاہری خوبیاں بھی باطنی خوبیوں کی طرح اپنی مثال آپ ہیں ۔ اس گراں قدر کاوش پر المحمود اکادمی کے ارباب حل و عقد مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

زیرِ تالیف کتاب

"لغات و اعرابِ قرآن"

کا

مقدّمہ

پروفیسر حافظ احمد یار

الحمد للّٰہ وحدہ- والصّلوٰۃ والسّلام علی عبدہ و رسولہ سیدنا محمد النّبی الامّیّ الذی لا نبیّ بعدہ- و علی اٰلہ و اصحابہ ومن دعا بدعوتہ و تمسّک بسنّتہ الی یوم الدّین

قرآن کریم کی عظمت و فضیلت اور اس کی اہمیت کسی تعریف یا تعارف کی محتاج نہیں۔

مسلمانوں کے لئے..... قرآن عظیم کی فضیلت کا مقام یہ ہے کہ وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ یہ خدائے ذوالجلال والاکرام کا وہ ابدی کلام اور سرمدی پیغام ہے جو خیرالانام محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی روشن دلیل اور معروف ترین معجزہ ہے..... اور یہ ربّ العالمین، احکم الحاکمین اللہ عزّوجلّ کی طرف سے خاتم النّبیّین رحمۃٌ للعالمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ روح الامین نازل کردہ وہ کتاب مبین ہے جو ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے..... جو برہان و نور ہے اور جو حبل اللہ المتین ہے.....

اور غیر مسلموں کے لئے..... اس کی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی انقلاب آفرینی اور اس کی کایا پلٹ "کیمیاگری" ان کے نزدیک بھی مسلّمہ ہے۔ یہی وہ کتابِ ہدایت ہے جس نے عربوں کو گمنامی اور گمراہی کے گڑھے سے نکال کر شہرت و حکومت اور رفعت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

قرآن کریم کی اس عظمت اور اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

غیر مسلم اپنی اغراض کے لئے اپنے آپ کو مطالعۂ قرآن پر مجبور پاتے ہیں۔ مسلمانوں کی سربلندی کے اصل "قرآنی راز" سے آگاہی حاصل کرنے پر ہی وہ مسلمانوں کو اس "نسخۂ کیمیا" سے غافل کر کے دوبارہ قعرِ مذلت میں گرانے کا کوئی مؤثر پروگرام بنا سکتے ہیں۔ یہ قرآنی تعلیمات کی انقلابی اہمیت اور نفوسِ انسانی میں اس کی تاثیر کا خوف ہی تو تھا جس کی بنا پر کفارِ مکہ نے قرآن کریم کے بارے میں "..... وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ" (حٰمٓ السجدۃ۔ ۲۶) کی وہ پالیسی اپنائی تھی جس میں آج بھی اسلام کے دشمنوں کو اپنے مذموم عزائم کے لئے امیدِ موہوم کی کچھ کرن دکھائی دیتی ہے۔

مسلمانوں پر تو قرآن حکیم پر ایمان لانے کے ساتھ ہی اس کے حقوق اربعہ..... تعلّم، تدبّر، تعمیل اور تبلیغ..... کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے۔

ان میں سے پہلا حق "تعلّمِ قرآن" یعنی اسے سیکھنے کا ہے جس میں قرأت اور تلاوت کے ساتھ اس کے معانی کا علم اور اس کے احکام کا فہم بھی شامل ہے..... اور اس کی روزانہ تلاوت یا قرأت سے نہ صرف ادائے حقوقِ قرآن کی ابتداء ہوتی ہے، بلکہ بافہم تلاوت تو قرآن کریم کے باقی تمام حقوق ادا کرنے کے لئے پیہم یاددہانی کا کام بھی دیتی ہے۔

تعلیم و تعلّم قرآن کے اسباب و ذرائع اور اس کے لئے مطلوب علوم و فنون متعدّد اور متنوّع ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ فہم اور تدبّر کے ساتھ مطالعۂ قرآن کا انحصار کئی امور بلکہ علوم پر ہے۔ تاہم بلا اختلافِ احد..... یہ امر مسلّم ہے کہ اس سمت میں پہلا قدم عربی زبان کا..... کسی درجۂ مہارت تک کا..... معقول فہم ہے۔

اور اگر عربی زبان کا یہ علم و فہم ماہرانہ اور "متخصصانہ" درجے میں ممکن نہ ہو تو بھی کم از کم عامیانہ اور "مبتدیانہ" سطح سے خاصا اونچا ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ صرف قرآن کریم ہی نہیں تمام علوم اسلامیہ کی اصل اور بنیادی کتابیں عربی زبان ہی میں ہیں۔

اور یہاں عربی زبان سے ہماری مراد بھی قرآن و حدیث والی زبان ہے جسے اصطلاحاً "العربیۃ الفصحٰی" کہتے ہیں..... اور یہی زبان دنیا بھر کے مسلمانوں کی مشترکہ دینی اور ثقافتی زبان ہے۔ عربی زبان کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد تو دین فہمی ہی ہے۔ اگرچہ آج کل عربی سیکھنے کی ضرورت کئی اور پہلوؤں سے بھی محسوس ہونے لگی ہے..... تاہم عرب ممالک میں بولی جانے والی عام روزمرہ کی (COLLOQUIAL) زبان جسے اصطلاحاً "اللغۃ

الدّارجۃ" کہتے ہیں..... اس کا سیکھنا سیاحوں اور عرب ممالک میں کام کرنے والے چھوٹے یا بڑے ملازموں یا دکانداروں وغیرہ کے لئے چاہے کتنا ہی ضروری یا مفید ہو..... قرآن فہمی تو کجا قرآن کی درست قرأت سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

عربی (یا کسی بھی زبان) کو سیکھنے کے لئے جدید ترین نظریۂ تعلیم کے مطابق..... چار مہارتوں کو بنیادی ضرورت سمجھا جاتا ہے..... استماع، نطق، قرأت اور کتابت (یعنی سننا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا) قرآن فہمی کے لئے عربی سیکھنے میں بھی یہ مہاراتِ اربعہ ناگزیر ہیں۔

اس کا سب سے پہلا مرحلہ ناظرہ قرآن خوانی سے شروع ہوتا ہے۔ عربی حروف کے درست مخارج اور ان کی اصوات (آوازوں) کو استماع اور نطق یعنی سن کر بولنے سے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ بعد کے مراحل میں یہ استماع و نطق عربی بول چال بذریعہ حوار و مکالمہ سیکھنے کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور ہونا چاہئیں..... تاہم عربی زبان سیکھنے کی خشتِ اوّل صحیح مخارج اور درست تلفظ کے ساتھ، قرآن خوانی کو قرار دینا اتنا اہم کام ہے کہ مشہور مصری عالم دکتور شوقی ضیف (جن کا تخصّص ہی عربی گرامر یعنی صرف و نحو ہے) نے اپنی کتاب "تجدید النحو" کے ابتدائی دس صفحات (ص ۴۹ تا ۵۸) میں کلمہ کی اقسام ثلاثہ (اسم، فعل، حرف) بیان کرنے کے فوراً بعد درست قرآن خوانی اور تجوید کے بنیادی قواعد مثل مخارج، اصواتِ حروف، حرکات، تشدید، تنوین، لین، مدّ، تفخیم، ترقیق، ہمزہ قطع و وصل، حروف شمسی و قمری اور ادغام و ابدال پر مفصّل بات کی ہے۔ (یعنی یہ تمام امور "قرآنی قاعدہ" میں آجانے چاہئیں)..... اور انہوں نے نطق سلیم اور تلفظ کی صحت کو عربی صرف و نحو کی تعلیم کے لئے بنیادی لازمی شرط (PRE-REQUISITE) قرار دیا ہے۔ بلکہ اس چیز سے غفلت کی بنا پر ہی مصریوں کی نئی (نوجوان) نسل کا لغۃ فصحی میں گنتگو کی صورت میں کلمات کے ناقص تلفظ اور حروف کے نطق میں لاابالی پن پر اظہار افسوس کیا ہے۔

صحیح مخارج، درست تلفظ اور عربی حروف کی صوتی خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے رواں اور شستہ لہجے میں ناظرہ قرآن خوانی سے تعلیمِ زبان کی تیسری مطلوبہ مہارت یعنی قرأت..... بلکہ بسرعت قرأت (RAPID READING) کے حصول کا وہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے جو نہ صرف تعلیمِ زبان (عربی) کی اہم اساس ہے۔ بلکہ اس کے ذریعے اس سے اگلے مراحل طے

کرنے کا کام آسان ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر تیسری مہارتِ زبان (قرأت) کے ساتھ ہی بچے کے لئے زبان کی چوتھی مہارت (کتابت) کے حصول کی بنیاد رکھ دی جائے..... یعنی متعلّم کو عربی حروف (بخط نسخ) بقدرِ امکان خوشخط لکھوانے کا کام شروع کر دیا جائے..... بلکہ اگر افریقی مسلم ممالک میں رائج طریقے کے مطابق متعلّم کو (چھوٹی عمر میں ہی) سبق میں پڑھی جانے والی قرآنی عبارات یا کلمات کو..... کاغذ یا تختی پر..... ہو بہو نقل نویسی کی عادت ڈالی اور مشق کرائی جائے..... تو یہ چیز عربی زبان کی مؤثر اور بسرعت و سہولت تعلیم کی مضبوط اور مستحکم بنیاد ثابت ہو سکتی ہے۔

اور اگر کسی آدمی کو ابتدائی عمر میں ان مہاراتِ اربعہ کے ساتھ قرآن کریم پڑھنے کا موقع نہیں ملا..... اور اب وہ عربی زبان کے سیکھنے کا بھی خواہاں ہے تو اسے حسبِ ضرورت پہلے چند دن یا چند ہفتے مخارج کی صحت، اور تلفظ کی درستی کے ساتھ قرآن کریم..... بلکہ عام مشکول عربی عبارات..... کی رواں قرأت (RAPID READING) کی مشق کر لینی چاہئے۔ اور اس کے ساتھ ہی عربی عبارات کو قرآنی اسلوبِ کتابت (خط نسخ) کے مطابق نقل کرنے یا لکھنے کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔

مندرجہ بالا امور عربی زبان کی تعلیم کے لئے "مالابدّ منہ" کی حیثیت رکھتے ہیں اس کے بعد عربی صرف ونحو کے قواعد کی تدریس اور ترجمتین کے ذریعے ان کی عملی مشق کا درجہ آتا ہے۔ اور یہاں بھی عربی کی کسی اچھی مشکول درسی کتاب (READER) کا مطالعہ (قرأت و معانی) تعلیمِ قواعد سے پہلے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اگر اسی تدریس کو دو ڈھائی گھنٹے روزانہ (مع مشقی کام HOME-WORK) دیئے جائیں تو طالب علم کی سابقہ تعلیمی استعداد (بی اے۔ ایف اے یا میٹرک ہونے) کے لحاظ سے ایک یا دو سال کے عرصے میں نہ صرف عربی زبان کا اچھا خاصہ ذخیرۂ الفاظ (VOCABULARY) بلکہ وہ تمام ضروری قواعد زبان..... صرف و نحو..... ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں..... جو ترجمۂ قرآن کی لغوی اور نحوی بنیادوں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں اور جن کا بطور سلیبس یا مقدارِ نصاب کے ہم ابھی آگے چل کر ذکر کریں گے۔

اس سے اگلے مراحل (اگر کوئی طے کرنا چاہے تو) میں عربی نظم و نثر کی کتابیں پڑھ کر ذوقِ ادب پیدا کرنے، اسالیبِ کلام سے آشنا ہونے کے بعد آخر پر درجہ تخصّص میں بلاغت اور

معانی و بیان کے اصولوں سے آگاہ ہونے اور ان کے عملی اطلاق کے مراحل طے کرنے سے عربی زبان وادب پر عبور اور اس میں مہارت کا علمی درجہ تکمیل پذیر ہوتا ہے..... تاہم یہ آخری مراحل قرآن فہمی کے بنیادی لوازمات نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کو تدبّر کے ساتھ فہم قرآن کی "تحسینیات" اور "مستحبّات" میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

تخصّص زبان کے اس آخری درجہ سے پہلے قواعد صرف و نحو کے ایک معقول اور معیاری نصاب (جن کا ذکر آگے آئے گا) کی کامیاب تکمیل کے بعد قرآن کریم کو..... ترجمہ کی حد تک..... براہ راست سمجھنے کے کام کا آغاز کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ طالب علم اس مرحلے پر فہم قرآن کے دو بنیادی عناصر..... لغات (مادہ و اشتقاق کی بحث) اور وجوہ اعراب کی بنیاد سے آگاہ ہو چکا ہوتا ہے وہ کلمات کی بنائی اور اعرابی حرکات کے تغیّرات کے اسباب و نتائج کو جاننے لگتا ہے اور معجم (ڈکشنری) کے استعمال پر قادر ہونے کی بناء پر وہ کلمات کے لُغوی معنی کی بحث کو سمجھ سکتا ہے۔ بلکہ عبارت کے اندر کلمات کے باہمی تعلق (ترکیب) کی بناء پر عبارت کے معنی متعیّن کرنے پر قادر ہو سکتا ہے۔ گویا وہ براہ راست فہم قرآن کی دہلیز پر آ کھڑا ہوتا ہے۔

اس "لغاتِ قرآن" اور "اعرابِ قرآن" کا فہم قرآن سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ اس بات سے کر لیجئے کہ عموماً ہر قابل ذکر مفسّر اپنی کتاب (تفسیر) میں تفسیر آیات (مثلاً بعض واقعات یا احکام کی تفصیل یا کسی نکتہ آفرینی وغیرہ) سے پہلے نصِّ قرآنی (عبارت) کے مفرد کلمات (الفاظ) کی لغوی تشریح اور مرکب کلمات (جملوں) میں کم از کم بعض اہم اعراب کی توضیح ضروری سمجھتا ہے..... اور بعض تفاسیر (مثلاً کشّاف، بیضاوی وغیرہ) اپنی اس خصوصیت کی بنا پر ہی اہل علم کے ہاں زیادہ مقبول ہوئی ہیں۔

خیال رہے کہ عربی دنیا کی واحد زندہ اور ترقی یافتہ زبان ہے جس میں کلمات (خصوصاً اسماء و افعال) کی بنیاد (عموماً) ایک سہ حرفی مادہ ہوتا ہے..... اگرچہ بعض دوسری سامی زبانوں مثلاً عبرانی، سریانی، آرامی، امہری، حبشی وغیرہ میں بھی یہ "مادۂ کلمات" والی بات پائی جاتی ہے لیکن ان میں سے اکثر یا تو اب مردہ زبانیں شمار ہوتی ہیں۔ یا ان زبانوں کے مقابلے پر عربی میں یہ چیز زیادہ وسیع اور ایسی ترقی یافتہ صورت میں پائی جاتی ہے کہ ایک ایک مادہ سے نکلنے والے

مشتق اور جامد کلمات میں سے معانی و مفاہیم کے اتنے چشمے پھوٹتے ہیں جنہوں نے عربی زبان کو ایک دریائے ناپیدا کنار بنا دیا ہے۔

عربی زبان اپنی ترقی کے یہ مدارج طے کر کے ظہور اسلام اور نزول قرآن سے پہلے (خصوصاً حجاز میں) اپنے بلوغ کو پہنچ چکی تھی۔ قرآن اور اسلام کی بدولت اسی عربی زبان کو حیاتِ دوام حاصل ہوئی۔ اور یہی زبان آج تک دنیائے اسلام کی مشترک دینی اور ثقافتی زبان ہے۔

دوسری طرف عربی دنیا کی ان چند زبانوں میں سے ایک ہے جن میں اسماء و افعال کے آخری حصے میں تصریف سے بعض قواعد و ضوابط کے ساتھ ایک تبدیلی (INFLECTION) واقع ہوتی ہے۔ جسے اعرابی تبدیلی یا اعرابی حالتیں یا صرف "اعراب" کہتے ہیں۔ یہ خصوصیت بھی دنیا کی بعض قدیم زبانوں مثلاً یونانی، لاطینی وغیرہ میں بھی موجود تھی۔ مگر آج کی زندہ زبانوں میں سے یہ چیز صرف تین زبانوں..... عربی، جرمن اور امہری (حبشی)..... میں پائی جاتی ہے..... اور عربی میں بھی یہ چیز قرآن کریم کی برکت سے صرف لغۃِ فصحٰی یعنی علمی عربی میں پائی جاتی ہے ورنہ روزمرہ کی بول چال... لغۃ دارجہ..... میں تو عرب بھی اسے خیرباد کہہ چکے ہیں۔

فہم قرآن کی کسی بھی علمی کوشش میں عربی زبان کی ان دو خصوصیات یعنی لغوی اور نحوی پہلوؤں..... لغات اور اعراب..... کو مدِّنظر رکھے بغیر چارہ نہیں۔ تفسیر کا درجہ اس کے بعد آتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ نصّ قرآنی (عبارت) کی تفسیر و توضیح کے کام کا آغاز ان دو امور سے ہی کیا جاسکتا ہے اور کیا جاتا ہے۔

بلکہ "لغات و اعرابِ قرآن" کی اسی اہمیت کے پیش نظر ان موضوعات پر مستقل تالیفات موجود ہیں جو خصوصاً ان دو موضوعات سے متعلق مشکل (غریب) کلمات یعنی غریب المفردات اور مشکل مرکبات یعنی غریب الاعراب سے بحث کرتی ہیں۔ مثلاً حسین بن محمد المعروف راغب اصفہانی (المتوفی ۵۰۲ھ) کی المفردات فی غریب القرآن اور (عبدالرحمٰن بن محمد المعروف ابن الانباری (المتوفی ۵۷۷ھ) کی البیان فی غریب اعراب القرآن..... اور یہ تو ہم نے صرف دو کتابوں کا نام لیا ہے ورنہ ان..... دو موضوعات..... میں سے ہر ایک موضوع پر بلکہ بعض دفعہ ان کے ضمنی موضوعات پر مستقل تالیفات میں یا بعض بڑی کتابوں کے مختص ابواب میں بحث کی گئی ہے۔ جن کا مختصر تعارف بھی ایک مستقل مقالے کا محتاج ہے۔ صرف ابن الندیم نے الفہرست میں اس قسم کی

ایسی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ دو امور (لغات اور اعراب قرآن) اگرچہ فہم قرآن یا ترجمۂ قرآن کی بنیاد ہیں۔ تاہم یہی اور محض یہی فیصلہ کن عامل نہیں ہیں۔ اس لئے کہ فہمِ قرآن کے دوسرے عوامل و ذرائع خصوصاً سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، تفسیرِ ماثور، سیرتِ طیبہ اور تاریخِ عرب وغیرہ سے بھی استفادہ ناگزیر ہے۔ اور پھر لغوی مباحث میں بھی عام و خاص، حقیقت و مجاز، صریح و کنایہ اور تشبیہ و استعارہ وغیرہ کے قواعد استعمال کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ اور سب سے بڑھ کر تو اس معاملے میں ایمان (عقیدہ کی درستی)، تقویٰ، خدا خوفی، دیانتداری اور اخلاصِ نیّت کا دخل ہے۔ ورنہ کسی عبارت کو من مانے معنی "پہنانا" یا کسی مجموعۂ عبارات میں سے اپنی مرضی کے موافق عبارت اور کلمات نکال دکھانا۔ یہ تو حضرتِ انسان کی وہ خصوصیت ہے جس کے مظاہر صرف "خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں" کی قسم کے نام نہاد مذہبی رہنماؤں کی تحریر و تقریر میں ہی نہیں بلکہ ہماری عدالتی کارروائیوں میں وکلاء کے باہم متصادم دلائل میں اور سیاسی لیڈروں کے مناظرانہ بیانات میں مشاہدہ کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ (وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ..... (الکہف - ۵۴)

اس جملہ معترضہ کے باوجود اس میں شک نہیں کہ لغات و اعراب قرآن کے علم کے بغیر قرآن کریم سے براہِ راست علمی یا فکری رابطہ ممکن نہیں۔ اس رابطہ کے بعد قرآن کریم سے ہدایت و رہنمائی پانا ..... یا قرآن کے ذریعے ہی اپنی گمراہی کو مستحکم کرنا ..... یہ تو "نصیب اپنا اپنا" والی بات ہے اور اس نصیب کا تعیّن کرنے والے اندرونی بیرونی عوامل کی بحث ایک الگ مسئلہ ہے۔

جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر بیان کیا ہے اس موضوع کی اہمیت کی بناء پر عربی زبان میں تو لغاتِ قرآن اور اعرابِ قرآن پر متعدّد اعلیٰ پایہ کی تالیفات موجود ہیں۔ تاہم اردو زبان میں ابھی اس چیز کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اور لغات القرآن پر تو پھر بھی اردو میں اچھا خاصا کام ہو چکا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض میں صرف اپنی اغراض کے لئے کام دینے والے الفاظ و معانی جمع کر کے اپنے لئے لغات القرآن کے نام پر ایک خود ساختہ سند مہیا کرنے کی کوشش ہی کی گئی

ہے۔ تاہم معقول اور دیانتدارانہ علمی کام بھی ضرور ہوا ہے۔ لیکن اعراب القرآن پر ابھی تک اردو میں کوئی کام نظر سے نہیں گزرا بعض تفاسیر (مثلاً حقانی) میں ترکیبِ نحوی کے نام سے اعراب القرآن کی کسی کتاب (عموماً عکبری) سے کچھ اقتباس بزبانِ عربی شامل کر دیئے گئے ہیں۔

اردو زبان میں اس موضوع پر کام نہ ہونے کی وجہ یہ تأثر یا خیال بھی ہے کہ اعراب کی بحث کو تو وہی سمجھے گا جس نے اچھی خاصی عربی گرامر پڑھی ہوگی اور جس نے اتنی عربی پڑھ لی ہو اس کو اردو میں اعراب سمجھانے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ ورنہ لوگ اب تک بیضاوی اور زمخشری کا ترجمہ بھی کر چکے ہوتے۔

یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ لغات اور اعراب کی بحث سمجھنے کے لئے ایک خاص سطح تک کی عربی دانی یا عربی صرف و نحو کے قواعد سے واقفیت ضروری ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس معیار تک..... بلکہ اس سے زیادہ عربی جاننے والوں میں سے بھی بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جنہوں نے کبھی پورے قرآن کریم کا لغات و اعراب کے ساتھ مطالعہ کیا ہو۔ اور اس میں یونیورسٹی اور درس نظامی کے فاضلین کا حال یکساں ہے۔ کسی ضرورت کے تحت یا کسی موقع کی مناسبت سے اس قسم کی بحث پر کسی کتاب میں نظر ڈال لینا اور بات ہے لیکن پورے قرآن کریم کا بالاستیعاب اس طریقے سے مطالعہ اور بات ہے۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعراب و لغات کے بیان کے ساتھ پورے قرآن مجید کا مطالعہ کہیں بھی داخلِ نصاب نہیں ہے۔

عربی جاننے والوں کو غم ہائے روزگار میں اس کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔

جب تک یہ چیز نصاب میں مقرر نہ کر دی جائے..... پابندی کے ساتھ پورے قرآن کا آیت بآیت اور لفظ بلفظ اس طریقے پر مطالعہ ناممکن ہے۔

یہ تجربہ غالباً صرف مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام قرآن اکیڈمی میں ہی کیا گیا ہے۔ جس میں روزانہ دو پیریڈ (کم و بیش ڈیڑھ گھنٹہ) دیتے ہوئے کم و بیش ایک برس میں الحمد سے والناس تک پورا قرآن کریم اعراب و لغات کے حوالے سے پڑھایا گیا ہے اور پڑھایا جا رہا ہے۔

(جاری ہے)

محاضراتِ قرآنی منعقدہ ۱۷ تا ۲۱ دسمبر ۸۸ء کراچی میں

اسلام کا نظامِ حیات

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کے خطابات کے

آڈیو اور ویڈیو کیسٹس

تیار کر لئے گئے ہیں

عنوان	آڈیو کیسٹ	قیمت	ویڈیو کیسٹ	قیمت
اسلامی نظام کی نظریاتی اساس	۲ (سی-۹۰)	۴۰/-	۱ (ای-۱۸۰)	۱۷۵/-
اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام	۲ 〃	۴۰/-	۱ 〃	۱۷۵/-
میزانسے :	۱۰ 〃	۲۰۰/-	۵ 〃	۸۷۵/-

ڈاک کے ذریعے منگوانے کی صورت میں آڈیو کیسٹس کے سیٹ کے لئے -/۱۵ روپے اور ویڈیو کیسٹس کے سیٹ کے لئے -/۲۰ روپے ڈاک خرچ ادا کرنا ہوگا۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون ۸۵۶۰۰۳

انجمن خدام القرآن سندھ۔ ۱۱۔ داؤد منزل شاہراہِ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پروفیسر احمد الدین ماہروی

تحفظِ اجناسِ خوردنی

(قرآنی نقطۂ نظر سے)

گذشتہ جنگِ عظیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اندازہ یہ تھا کہ لڑائی عرصہ تک جاری رہے گی اور اس کے واسطے نہ صرف اسلحہ بلکہ خوراک کی فراہمی بھی ایک اہم مسئلہ ثابت ہوگی۔ اس پیش بندی کے تحت برطانوی حکومت نے غلّہ کے تحفّظ کا انتظام انتہائی ضروری سمجھ کر محکمہ زراعت میں اس کا ایک جداگانہ شعبہ قائم کیا۔ ولایت سے ماہرین بلائے گئے کہ وہ اناج بالخصوص گندم کو زیادہ سے زیادہ عرصہ محفوظ رکھنے کی سائنسی تدابیر عملہ کے لوگوں کو سمجھائیں جن پر عملدرآمد کر کے بہترین نتائج حاصل کر سکیں۔ میرے ایک شاگرد کو بھی یہ تربیت حاصل کرنے کے واسطے بلایا گیا تھا۔ واپسی میں ایک روز کے واسطے مجھ سے ملنے بھی آیا۔ دریافت پر اس نے بتایا کہ اگر فلاں فلاں کیمیاوی اجزاء کا آمیزہ غلّہ پر چھڑک دیا جائے تو وہ تین سال تک اپنی اصلی حالت میں قائم رہ سکتا ہے۔ اس پر میرے ذہن میں یکایک قرآن حکیم کی آیۃ آئی اور میرے منہ سے نکل گیا کہ اللہ نے تو ہمیں سات سال تک غلّہ محفوظ رکھنے کی ایسی ترکیب بتائی ہے کہ بقول شخصے ہلدی لگے نہ پھٹکڑی اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ اس وقت اتفاق سے میرے پاس عربی و اسلامیات کے پروفیسر جو دیوبند کے فاضل اور ایک قابل استاد تھے بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے مجھے ٹوکا کہ قرآن کے متعلق ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں جن کی کوئی سند نہ ہو۔ پھر زیرِ لب یہ بھی کہہ گئے کہ انگریزی تعلیم یافتہ نہ سمجھتے ہیں نہ بوجھتے، جس کے متعلق جو دل میں آیا کہہ جاتے ہیں۔

اس پر میں نے کلام پاک کی جلد اٹھا کر انہیں سورۂ یوسف کی وہ آیات دکھائیں جن میں شاہِ مصر کے اس پریشان کن خواب کا ذکر ہے جس کی تعبیر مصر کا کوئی بڑے سے بڑا عالم یا دانش ور بھی نہ بتا سکا اور اسے منتشر خیالات کا نتیجہ یا احلام کہہ کر خارج از بحث قرار دے دیا۔ لیکن حضرت

یوسفؑ نے نہ صرف اس کی واضح تشریح فرمائی بلکہ اس ہمہ گیر قحط سے بچنے کی راہ بھی بتادی ۔ ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

"بادشاہ نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ سات مچرب (موٹی) گائیں جن کو سات دُبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے (جنہیں) دوسرے خشک خوشے (کھا رہے ہیں) ۔ اے سردارو! اگر تم خوابوں کی تعبیر کر سکتے ہو تو میرے اس خواب کی تعبیر کرو ۔ انہوں نے کہا یہ پریشان خیالات ہیں اور ہمیں ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں آتی ....."

..... حضرت یوسفؑ نے کہا ۔ "تم سات برس خوب کھیتی کرو گے ۔ پس جو کچھ تم کاٹو تو اُسے خوشوں کے اندر ہی رہنے دو بجز اس تھوڑے کے جو تم کھاؤ ۔ اس کے بعد تمہارے لئے سات بڑے سخت سال آئیں گے اور تم وہ سب کچھ جو جمع کر رکھو گے کھا جاؤ گے بجز اس تھوڑے سے غلّہ کے جو (بیج کے واسطے) تم بچا لو گے ۔ اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ (انگور سے شراب) نچوڑیں گے ۔" (سورۃ یوسف آیات ۴۳ - ۴۹)

اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت میرے گاؤں کا کہن سالہ نمبردار جوہری مل جائیداد کے متعلق کچھ ضروری ہدایات حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا ۔ وہ تمام باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا اور بقول شخصیکہ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے" کہنے لگا "بے شک یہ بھگوان ہی کی بات ہے ۔ ہم بوڑھے ہو گئے ۔ ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری مگر یہ معمولی سی بات سمجھ میں نہ آئی ۔ ہر سال ہمارا سینکڑوں من اناج دو طرح سے ضائع ہوتا ہے ۔ یا تو اس میں گھن لگ جاتا ہے یا اُسے موٹے (چوہے) نہ صرف کھا جاتے بلکہ اس کے ڈھیر پر چڑھ کر پیشاب کرتے اور بیشتر حصّہ بیکار کر دیتے ہیں ۔ اب جو میں اس پر غور کرتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ اگر ہم غلّہ کو بالوں کے اندر چھوڑ دیں تو اوپر کا خول اتنا سخت ہوتا ہے کہ گھن اس کے اندر گھس ہی نہ سکے گا اور سارا اناج محفوظ رہے گا ۔ دوسرے یہ کہ اس کی بالی چکنی اور پھسلواں ہوتی ہے ۔ چوہا کنارے پر جتنا چاہے کھالے لیکن غلّہ کے ڈھیر پر چڑھنا اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا اور وہ سب اس کی گندگی اور تباہ کاری سے بچا رہے گا ۔"

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر گیا ، بات بھولی بسری ہو گئی لیکن حال ہی میں جب ایک حوالہ کی

تلاش میں انجیل مقدّس کو کھولا تو اتفاق سے حضرت یوسفؑ کا یہی واقعہ سامنے آگیا۔ پڑھا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سارا قصّہ قریب قریب وہی ہے جس کو قرآن نے " احسن القصص (بہترین قصّہ) کہہ کر بیان کیا ہے لیکن ایک چھوٹا سا فقرہ جس میں غلّہ کو محفوظ رکھنے کا راز بتایا گیا ہے، مفقود ہے۔ حالانکہ اس کتاب مقدّس میں ہر چیز غیر معمولی تفصیل کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی قرآن کی آیات کے مقابلہ میں چالیس آیتوں پر مشتمل ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

" فرعون نے خواب میں دیکھا کہ وہ لب دریا کھڑا ہے اور اسی دریا میں سے سات خوبصورت اور موٹی گائیں نکل کر نیساں میں چرنے لگیں۔ اُن کے بعد اور سات بدشکل اور دُبلی پتلی گائیں دریا سے نکلیں اور ان ساتوں خوبصورت اور موٹی گایوں کو کھا گئیں۔ پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا کہ ایک ڈنٹھی میں اناج کی سات موٹی اور اچھی اچھی بالیں نکلیں۔ ان کے بعد اور سات پتلی اور پوربی ہوا کی ماری مرجھائی ہوئی بالیں نکلیں۔ یہ پتلی بالیں ان ساتوں موٹی اور بھری ہوئی بالوں کو نگل گئیں اور فرعونؑ جاگ گیا اور اسے معلوم ہوا کہ یہ خواب تھا۔ صبح کو یوں ہوا کہ اس کا جی گھبرایا۔ تب اس نے مصر کے سب جادوگروں اور سب دانش مندوں کو بُلوا بھیجا اور اپنا خواب ان کو بتایا۔ پر اُن میں سے کوئی فرعون کے آگے ان کی تعبیر نہ کر سکا۔ (اس کے بعد اس کے ساتھی نے فرعون سے اپنے خواب اور حضرت یوسفؑ کا ذکر کیا تو) تب فرعون نے یوسفؑ کو بُلا بھیجا (اور ان سے اپنے دونوں خواب بیان کئے (جس کی تفصیل دوبارہ بیان ہوئی ہے)۔ تب یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ دونوں خواب ایک ہی ہیں، جو کچھ خدا کرنے کو ہے اسے اس نے فرعون پر ظاہر کر دیا ہے۔ وہ سات اچھی اچھی گائیں سات برس ہیں اور وہ اچھی اچھی بالیں بھی سات برس ہیں۔ خواب ایک ہی ہے اور وہ سات بدشکل اور دُبلی گائیں جو ان کے بعد نکلیں اور وہ سات خالی اور پوربی ہوا کی ماری مرجھائی ہوئی بالیں بھی سات برس ہی ہیں مگر کال کے سات برس.... دیکھ سارے ملک مصر میں سات برس تو پیداوار کثیر کے ہوں گے۔ اُن کے بعد سات برس کال کے آئیں گے اور تمام ملک مصر میں لوگ اس ساری پیداوار کو بھول جائیں گے اور یہ کال ملک کو تباہ کر دے گا اور ارزانی ملک میں یاد بھی نہ رہے گی کیونکہ جو کال ملک میں پڑے گا وہ نہایت ہی سخت ہوگا..... فرعون کو چاہیئے کہ ایک دانشور اور عقلمند آدمی کو تلاش کرے اور اسے ملک مصر پر مختار بنائے۔ فرعون یہ کرے کہ اس آدمی کو اختیار ہو کہ وہ ملک میں ناظروں کو مقرر کرے اور

یوسفؑ نے نہ صرف اس کی واضح تشریح فرمائی بلکہ اس ہمہ گیر قحط سے بچنے کی راہ بھی بتادی ۔ ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

"بادشاہ نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ سات مچرب (موٹی) گائیں جن کو سات دُبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات سرسبز خوشے (جنہیں) دوسرے خشک خوشے (کھا رہے ہیں) ۔ اے سردارو! اگر تم خوابوں کی تعبیر کر سکتے ہو تو میرے اس خواب کی تعبیر کرو ۔ انہوں نے کہا یہ پریشان خیالات ہیں اور ہمیں ایسے خوابوں کی تعبیر نہیں آتی ....."

..... حضرت یوسفؑ نے کہا ۔ "تم سات برس خوب کھیتی کرو گے ۔ پس جو کچھ تم کاٹو تو اُسے خوشوں کے اندر ہی رہنے دو بجز اس تھوڑے کے جو تم کھاؤ ۔ اس کے بعد تمہارے لئے سات بڑے سخت سال آئیں گے اور تم وہ سب کچھ جو جمع کر رکھو گے کھا جاؤ گے بجز اس تھوڑے سے غلّہ کے جو (بیج کے واسطے) تم بچا لو گے ۔ اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں خوب بارش ہوگی اور لوگ (انگور سے شراب) نچوڑیں گے ۔" (سورۃ یوسف آیات ۴۳ - ۴۹)

اتفاق دیکھئے کہ اسی وقت میرے گاؤں کا کہن سالہ نمبردار جوہری مل جائیداد کے متعلق کچھ ضروری ہدایات حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہوا تھا ۔ وہ تمام باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا اور بقول شخصیکہ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے" کہنے لگا "بے شک یہ بھگوان ہی کی بات ہے ۔ ہم بوڑھے ہو گئے ۔ ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں گذری مگر یہ معمولی سی بات سمجھ میں نہ آئی ۔ ہر سال ہمارا سینکڑوں من اناج دو طرح سے ضائع ہوتا ہے ۔ یا تو اس میں گھن لگ جاتا ہے یا اُسے موٹے (چوہے) نہ صرف کھا جاتے بلکہ اس کے ڈھیر پر چڑھ کر پیشاب کرتے اور بیشتر حصّہ بیکار کر دیتے ہیں ۔ اب جو میں اس پر غور کرتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ اگر ہم غلّہ کو بالوں کے اندر چھوڑ دیں تو اوپر کا خول اتنا سخت ہوتا ہے کہ گھن اس کے اندر گھس ہی نہ سکے گا اور سارا اناج محفوظ رہے گا ۔ دوسرے یہ کہ اس کی بالی چکنی اور پھسلواں ہوتی ہے ۔ چوہا کنارے پر جتنا چاہے کھالے لیکن غلّہ کے ڈھیر پر چڑھنا اس کے لئے ناممکن ہو جائے گا اور وہ سب اس کی گندگی اور تباہ کاری سے بچا رہے گا ۔"

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر گیا ، بات بھولی بسری ہو گئی لیکن حال ہی میں جب ایک حوالہ کی

تلاش میں انجیل مقدّس کو کھولا تو اتفاق سے حضرت یوسفؑ کا یہی واقعہ سامنے آگیا۔ پڑھا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سارا قصّہ قریب قریب وہی ہے جس کو قرآن نے " احسن القصص (بہترین قصّہ) کہہ کر بیان کیا ہے لیکن ایک چھوٹا سا فقرہ جس میں غلّہ کو محفوظ رکھنے کا راز بتایا گیا ہے، مفقود ہے۔ حالانکہ اس کتاب مقدّس میں ہر چیز غیر معمولی تفصیل کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ بھی قرآن کی آیات کے مقابلہ میں چالیس آیتوں پر مشتمل ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

" فرعون نے خواب میں دیکھا کہ وہ لب دریا کھڑا ہے اور اسی دریا میں سے سات خوبصورت اور موٹی گائیں نکل کر نیساں میں چرنے لگیں۔ اُن کے بعد اور سات بدشکل اور دُبلی پتلی گائیں دریا سے نکلیں اور ان ساتوں خوبصورت اور موٹی گایوں کو کھا گئیں۔ پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا کہ ایک ڈنٹھی میں اناج کی سات موٹی اور اچھی اچھی بالیں نکلیں۔ ان کے بعد اور سات پتلی اور پوربی ہوا کی ماری مرجھائی ہوئی بالیں نکلیں۔ یہ پتلی بالیں ان ساتوں موٹی اور بھری ہوئی بالوں کو نگل گئیں اور فرعونؑ جاگ گیا اور اسے معلوم ہوا کہ یہ خواب تھا۔ صبح کو یوں ہوا کہ اس کا جی گھبرایا۔ تب اس نے مصر کے سب جادوگروں اور سب دانش مندوں کو بُلوا بھیجا اور اپنا خواب ان کو بتایا۔ پر اُن میں سے کوئی فرعون کے آگے ان کی تعبیر نہ کر سکا۔ (اس کے بعد اس کے ساتھی نے فرعون سے اپنے خواب اور حضرت یوسفؑ کا ذکر کیا تو) تب فرعون نے یوسفؑ کو بُلا بھیجا (اور ان سے اپنے دونوں خواب بیان کئے (جس کی تفصیل دوبارہ بیان ہوئی ہے)۔ تب یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ دونوں خواب ایک ہی ہیں، جو کچھ خدا کرنے کو ہے اسے اس نے فرعون پر ظاہر کر دیا ہے۔ وہ سات اچھی اچھی گائیں سات برس ہیں اور وہ اچھی اچھی بالیں بھی سات برس ہیں۔ خواب ایک ہی ہے اور وہ سات بدشکل اور دُبلی گائیں جو ان کے بعد نکلیں اور وہ سات خالی اور پوربی ہوا کی ماری مرجھائی ہوئی بالیں بھی سات برس ہی ہیں مگر کال کے سات برس.... دیکھ سارے ملک مصر میں سات برس تو پیداوار کثیر کے ہوں گے۔ اُن کے بعد سات برس کال کے آئیں گے اور تمام ملک مصر میں لوگ اس ساری پیداوار کو بھول جائیں گے اور یہ کال ملک کو تباہ کر دے گا اور ارزانی ملک میں یاد بھی نہ رہے گی کیونکہ جو کال ملک میں پڑے گا وہ نہایت ہی سخت ہوگا..... فرعون کو چاہیئے کہ ایک دانشور اور عقلمند آدمی کو تلاش کرے اور اسے ملک مصر پر مختار بنائے۔ فرعون یہ کرے کہ اس آدمی کو اختیار ہو کہ وہ ملک میں ناظروں کو مقرر کرے اور

ارزانی کے سات برسوں میں سارے ملک مصر کی پیداوار کا پانچواں حصّہ کرلے اور وہ ان اچھے برسوں میں جو آتے ہیں سب کھانے کی چیزیں جمع کریں اور شہر شہر میں غلّہ جو فرعون کے اختیار میں ہو خوراک کے لئے فراہم کر کے اس کی حفاظت کریں[ے] یہی غلّہ ملک کے لئے ذخیرہ ہوگا اور ساتوں برس کے لئے جب تک ملک میں کال رہے گا کافی ہوگا تاکہ کال کی وجہ سے ملک برباد نہ ہو جائے ......" (کتاب پیدائش باب ۴۱ ۔ آیات ۱ تا ۴۰)

آپ نے دیکھا کہ قرآن کے مقابلے میں انجیل نے ہر بات کو کتنی واضح طور پر بیان کیا ہے لیکن اناج کو بالوں میں محفوظ رکھنے کا طریقہ اس میں نہیں پایا جاتا۔ غور طلب امر یہ ہے کہ اس مفید اور آسان نسخہ سے اس کے صفحات کیوں خالی ہیں۔ دو ہی اسباب ممکن ہیں یا تو اس کی تدوین کرنے والوں نے اس وضاحت کو غیر ضروری سمجھ کر ترک کر دیا ہو۔ لیکن یہ بات اس لئے قرینِ قیاس نہیں کہ اس ترکیب کی افادیت مسلّمہ ہے یا پھر یہ فقرہ اصل متن ہی میں موجود نہ ہو۔ اس پر لازمی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اور انجیل دونوں ہی آسمانی کتابیں ہیں۔ دونوں میں ایک ہی واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ تحریف کی یہاں نہ ضرورت ہے نہ گنجائش پھر یہ فرق کیوں ہے۔

اس کے لئے ہمیں ان الفاظ پر غور کرنا ہوگا جو خدا تعالیٰ نے قرآن کی فضیلت میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً اسے ابتدا ہی میں "کتاب" سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی کتاب الاحکام کے ہیں۔ فرقان کہا گیا ہے جو کھرے کھوٹے کو الگ کر کے دکھاتی ہے۔ "ہدیٰ" کے نام سے یاد کیا ہے جو انسان کی صحیح رہنمائی کرتی ہے۔ "نور" فرمایا گیا ہے جو دل و دماغ کو منوّر کرتی ہے۔ "موعظۃ" کا لقب دیا گیا ہے کیونکہ اس میں ہر طرح کی نصیحتیں موجود ہیں۔ وغیرہ۔ اس طرح اس کو "حکمۃ" بھی کہا گیا ہے جس کے معنی دانائی، سمجھ داری، علم اور وقوف کے ہیں۔ ان تمام صفات کو ایک کتاب میں جمع کر دینے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ پچھلی تمام آسمانی کتابیں ایک خاص زمانہ اور ماحول کے مطابق نازل ہوئی تھیں اور ان میں حالات کے مطابق امور اور احکام کی تفصیل تھی۔ لیکن قرآن چونکہ آخری صحیفۂ مکرّم ہے اور اسے قیامت یا انسانی زندگی کے اختتام تک باقی رہنا ہے۔ اس لئے اس

باقی ص ۴۶

ے اس جگہ تحفّظ کا جو گُر قرآن بتاتا ہے وہ غائب ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور تخلیق

عملِ تخلیق میں حق کے ساتھ باطل، نیکی کے ساتھ بدی اور زیبائی کے ساتھ زشتی کا ظہور ضروری ہے

الغرض خودی کی فطرت کی بنا پر جس میں جمالی اور جلالی دونوں قسم کی صفات موجود ہیں یہ ضروری ہے کہ جب خودی ایک حسین اور کامل نصب العینی مخلوق کو بتدریج وجود میں لانے کا عمل شروع کرے تو اس عمل کی ابتدا کے ساتھ ہی حسن کے بالمقابل قبح، زیبائی کے بالمقابل زشتی، حق کے بالمقابل باطل اور نیکی کے بالمقابل بدی فوراً موجود ہو جائیں۔ جب تک تخلیق کا آغاز نہ ہو اس وقت تک عملی طور پر معلوم نہیں ہو سکتا کہ کون سی چیز مقصدِ تخلیق کے مطابق ہے اور کون سی غیر مطابق، لہٰذا حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، حسن کیا ہے اور قبح کیا ہے، زیبائی کیا ہے اور زشتی کیا ہے، نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے، خیر کیا ہے اور شر کیا ہے۔ جب تک شاخ نہیں پھوٹتی نہ گل ہوتا ہے اور نہ خار۔ اور جب پھوٹتی ہے تو دونوں نکل آتے ہیں۔ اسی طرح سے جب تک خودی تخلیق کا آغاز نہیں کرتی زشت اور نکو دونوں کا وجود نہیں ہوتا لیکن جب آغاز کرتی ہے تو دونوں خود بخود بیک وقت نمودار ہو جاتے ہیں۔ ورنہ تخلیق جاری ہی نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ تخلیق ترکِ زشت اور اختیارِ نکو کا ہی نام ہے۔ اقبال نے اس کاشفِ اسرارِ حقیقت کو دو شعروں میں بیان کیا ہے:

چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست
زباں لرزد کہ معنی ہیچ دار است
بروں از شاخ بینی خار و گل را
درونِ او نہ گل پیدا نہ خار است

تخلیق سے روگردانی کفر ہے

انسان بھی جب نیکی اختیار کرتا ہے اور بدی ترک کرتا ہے تو خدا کے مقصد کی تائید کرتا ہے اور خدا کی تخلیق میں شریک ہوتا ہے۔ اگر وہ خدا کی تخلیق میں شریک نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے بدی کو اختیار کر لیا ہے اور نیکی کو ترک کر دیا ہے اور وہ خدا کے تصورِ حسن اور مقصدِ تخلیق کا مخالف ہے۔ ایسے شخص کو اگر کافر یا زندیق کہا جائے تو بالکل بجا ہے:

ہر کہ اُو را لذّتِ تخلیق نیست
پیشِ ما جُز کافر و زندیق نیست

لوحِ محفوظ اور تقدیر

جیسا کہ اُوپر عرض کیا گیا ہے کائنات کی شعوری یا ذہنی حالت میں جسے قرآن حکیم نے لوحِ محفوظ یا اُمّ الکتاب یا کتابِ مبین یا کتابِ محفوظ کہا ہے، تخلیق کے امکانات کے تمام سلسلے موجود ہوتے ہیں اور ہر سلسلۂ امکانات آزادانہ طور پر ظہور پذیر ہو کر رد یا قبول کیے جانے کے لیے مہیا ہوتا ہے۔ تاہم ان میں سے صرف ایک سلسلۂ امکانات ایسا ہوتا ہے جو خدا کے مقصد سے پوری پوری مطابقت رکھتا ہے اور قبول ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ تخلیق کے آزاد ہونے کے باوجود کیوں قرآن نے فرمایا ہے کہ کوئی خشک یا تر چیز لوحِ محفوظ سے باہر نہیں (وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۵۹۔۶) اور ایک حدیث میں ہے کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ لکھا گیا ہے اور اسے لکھنے کے بعد قلم خشک ہو گیا ہے کہ اس سے اور کچھ لکھا نہیں جا سکتا (جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ) کائنات کی اسی شعوری حالت کو اقبال زمانِ خالص کہتا ہے۔ اسی زمانِ خالص کو قرآن حکیم نے تقدیر کا نام بھی دیا ہے۔

اقبال لکھتا ہے:-

زمانِ خالص جیسا کہ ہمارے شعوری تجربہ کے گہرے تجزیہ سے آشکار ہے۔ الگ

الگ رجعت پذیر واقعات کی ایک لڑی نہیں بلکہ ایک عضوی کُل ہے جسمیں ماضی پیچھے نہیں رہ جاتا بلکہ حال کے ساتھ رہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے مستقبل زمانِ خالص کے لیے ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر موجود ہوتا ہے لیکن ان معنوں میں نہیں کہ وہ سامنے پڑا ہوا ہے اور اُسے فقط عبور کرنا باقی ہے بلکہ ان معنوں میں کہ وہ اس کی فطرت میں ایک ایسے امکان کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے جسے آزادانہ طور پر رد یا قبول کیا جا سکتا ہے۔ جب زمان کو اس طرح سے ایک عضوی کُل کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اسی کو قرآن حکیم نے تقدیر کا نام دیا ہے اور یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے عالم اسلامی کے اندر اور باہر نہایت ہی غلط طور پر سمجھا گیا ہے۔ تقدیر زمان کی وہ حالت ہے جس میں اس کے ممکنات ابھی پردۂ خفا سے باہر آئے ہوئے نہیں ہوتے۔"

قرآن حکیم کا نظریۂ تخلیق اور خودی

تخلیق کائنات کے متعلق اقبال کا یہ نظریہ کہ اس کا بنیادی سبب خدا کی صفت محبّت اور اس کے ضمن میں اور اُس کے ماتحت خدا کی تمام صفاتِ جلال و جمال کا اظہار ہے قرآن حکیم کے ارشادات کے مطابق ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ ایک کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

(۱) وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (الدخان: ۳۸-۳۹)

(اور ہم نے کائنات کو کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ ہم نے اُسے بالحق پیدا کیا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

(۲) خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے بے شک اس حقیقت کے اندر اس پر ایمان لانے والوں کے لیے خدا کا ایک نشان ہے)

(۳) وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (الجاثیۃ: ۲۲)

(اور خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے اور ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا)

بعض قدیم وجدید مفسرین نے بالحق سے مراد یہ لی ہے کہ کائنات کی تخلیق بے مقصد نہیں بلکہ یہ کسی نظام اور قانون کی "ضبط اور ترتیب" اور کسی "حکمت اور مصلحت" کے مطابق ہے لیکن جب ہم اُوپر کی آیات میں سے آیت نمبر ایک کی روشنی میں اس بات پر غور کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کے نزدیک بالحق کا جو مفہوم بھی ہے وہ کھیل یا لعب کے برعکس ہے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ بالحق کی یہ تفسیر قرآن حکیم کے مفہوم کو پوری طرح سے ادا نہیں کرتی۔

لعب اور تخلیق میں فرق

کیونکہ اگر ہم کسی کھیل پر مثلاً فٹ بال، کرکٹ یا شطرنج وغیرہ پر غور کریں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ہر کھیل کا بھی ایک مقصد یا نصب العین ہوتا ہے مثلاً فٹ بال کھیلنے والی ٹیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ رکاوٹوں کے باوجود زیادہ سے زیادہ گول جیتے کرکٹ کی ٹیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسری ٹیم سے زیادہ دوڑیں بنائے اور شطرنج کھیلنے والی ہر پارٹی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مقابل کی پارٹی کو پہلے مات کرے۔ وعلیٰ ہذا القیاس، اور پھر ہر کھیل کے عمل کے لیے کھیل کے مقصد کے ماتحت اور اس کے تنگ دائرہ کے اندر بھی ایک "نظام اور قانون" ایک "ضبط اور ترتیب" اور ایک "حکمت اور مصلحت" کا وجود ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر کھیل کے معین قاعدے اور ضابطے اور طریقے ہوتے ہیں۔ دراصل ایک کھیل اور سنجیدہ عمل میں فرق یہ نہیں کہ ایک کا مقصد نہیں ہوتا اور دوسرے کا مقصد ہوتا ہے۔ بلکہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ کھیل کا مقصد نقلی اور فرضی اور بناوٹی ہوتا ہے جس کا خودی کی فطرت کے سچے تقاضوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کے برعکس سنجیدہ عمل کا مقصد خودی کی غیر مبدل فطرت اور اس کے نصب العین کی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور خودی کی آرزوئے حسن کی تشفی کرتا ہے۔ حق خدا کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک ہے۔ خدا حق ہے کیونکہ قائم بالذات لازوال

اور ثابت اور اٹل ہے۔

فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ۔ (یونس: ۳۲)

(یہ تمہارا پروردگار ہے جو حق ہے)

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ۔ (طٰہٰ: ۱۱۴)

(پس بلند ہے اللہ جو بادشاہ ہے برحق)

خدا کی ذات کی مرکزی صفت محبت بھی حق ہے اور اس کے سلسلہ میں اس کے شوؤن اور کوائف کے طور پر اظہار پانے والی جملہ صفات جلال و جمال بھی حق ہیں۔ اسی طرح سے خدا کی محبت اور جملہ صفات جمال و جلال کا مقصود اور مطلوب یعنی خدا کا نصب العین (یا آئندہ زمانہ میں حالتِ کمال کو پہنچنے والی کائنات یا نوع انسانی) بھی حق ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی صفاتِ حقہ سے پیدا ہوتا ہے اور ان کا مرجع اور مظہر ہے۔

اِک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے فقط نمودِ سیمیائی!

تخلیق بالحق کا مطلب

لہٰذا تخلیق بالحق کا مطلب ہے ایسی تخلیق جو خدا کی صفاتِ حقہ کے اظہار کے لیے عمل میں آئی ہو اور جس میں خدا کی صفاتِ حقہ کا اظہار ہو رہا ہو۔ کائنات کی تخلیق تخلیق بالحق ہے۔ کیونکہ یہ خدا کی صفاتِ حقہ کے اظہار کے لیے عمل میں آئی ہے اور اس میں خدا کی صفاتِ حقہ جلوہ گر ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے کائنات کی تخلیق بالحق کو خدا کی ہستی اور صفات کا اور نیز اس بات کا کہ خدا پر ایمان لانا ضروری ہے ایک نشان یا ثبوت کہا ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (العنکبوت: ۴۴)

خدا نے کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ بیشک اس حقیقت پر ایمان لانے والوں کے لیے اس کے اندر خدا کا ایک نشان یا ثبوت موجود ہے

تخلیق بالحق میں نشانِ راہ

کائنات کی تخلیق بالحق ایک نشان اس لیے ہے کہ

اوّل جو اس پر ایمان لائے گا اسے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ اُسے حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت کرنا ہے ورنہ وہ باطل کے ساتھ خود بھی پس جائے گا۔

دوم۔ چونکہ کائنات کی تخلیق تخلیق بالحق ہے وہ خدا کی صفات کی جلوہ گاہ ہے اور لہٰذا خدا کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ اگر کائنات کی تخلیق بالحق نہ ہوتی تو اس میں خدا کی مرکزی صفت محبت کا اظہار نہ ہوتا یعنی اس کا مقصد خدا کا کوئی سچا اور محبوب نصب العین نہ ہوتا اور اگر اس میں صفت محبت کا اظہار نہ ہوتا تو اس میں ربوبیت یعنی تدریجی تربیت اور تکمیل بھی نہ ہوتی اور چونکہ خدا کی تمام صفات ربوبیت کے عمل میں اظہار پاتی ہیں لہٰذا اس صورت میں کائنات کے اندر خدا کی صفات جمال و جلال کا اظہار نہ ہو سکتا۔ ایسی صورت میں اس تخلیق کا مشاہدہ اور مطالعہ ہمارے لیے معرفتِ حق کا سبب نہ بن سکتا لیکن چونکہ کائنات کی تخلیق بالحق ہے کائنات خدا کی ہستی اور صفات کا نشان اور خدا پر ایمان لانے کی ضرورت کا ثبوت اور خدا کی معرفت کا ذریعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کائنات کی تخلیق بالحق نہ ہوتی تو ہم ایمان لانے کے لیے مکلف اور جزا اور سزا کے مستحق نہ ٹھہرتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا ہے:

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (الجاثیۃ: ۲۲)

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق پیدا کیا ہے تاکہ ہر جان کو اس کے عمل کی جزا یا سزا ملے اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

فرضی نصب العین اور غلط نصب العین میں فرق نہیں

کھیل کے نقلی، بناوٹی اور فرضی نصب العین سے جو عمل سرزد ہوتا ہے وہ انسان کو اس کے فطری مقصودِ حیات کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں لے جاتا۔ چونکہ غلط نصب العین بھی فرضی

نصب العین کی طرح انسان کو اس کے فطری مقصود کی طرف بڑھنے نہیں دیتا لہٰذا غلط نصب العین کا معتقد بھی فرضی نصب العین کے پرستار کی طرح ایک بیکار مشغلہ یا کھیل میں مصروف رہتا ہے۔ اگر ایسے شخص کو اس دنیا کی زندگی میں سفلی خواہشات کی بے لگام تشفی کی وجہ سے ایک گونہ عارضی مسرت یا راحت نصیب ہو جائے تو اس پر اترانے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس کا انجام خدا کا وہ عذاب ہوتا ہے جو انسان کو اپنے فطری تقاضوں کو روکنے، دبانے یا نظر انداز کرنے کی وجہ سے جھیلنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غلط نصب العینوں کی پیروی کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ ان کا دین لہو و لعب ہے کیونکہ ان کا نصب العین دنیاوی زندگی کا تعیّش ہے خدا نہیں۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (الانعام: ۷۰)

اور جن لوگوں نے کھیل اور تماشا کو اپنا دین بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے، اُن سے کوئی سروکار نہ رکھیے اور قرآن سے ان کو نصیحت کرتے رہیئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کوئی جان اپنے کیے کی وجہ سے ہلاک ہو

لعب اور تخلیق میں دُوسرا فرق

کھیل اور سنجیدہ عمل میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کھیل کے نتیجہ کے طور پر فریقین میں سے کوئی بھی ہار سکتا ہے اور پھر اس میں نہ ہارنے کی کوئی اصلی اور حقیقی سزا ہے اور نہ جیتنے کا کوئی اصلی اور حقیقی انعام ہے اگر کوئی سزا یا انعام ہے تو وہ بھی نقلی اور بناوٹی ہے اور کھیل ہی کا ایک حصّہ ہے اس کے برعکس سنجیدہ عمل کے نتیجہ کے طور پر ہمیشہ ایک فریق کی فتح ہوتی ہے اور وہ اہلِ حق کا گروہ ہوتا ہے اور ہمیشہ دوسرے فریق کی ناکامی اور رسوائی ہوتی ہے اور وہ اہلِ باطل کا گروہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر خدا نے کوئی کھیل کھیلنا ہوتا تو وہ اس کائنات کی صورت میں نہ ہوتا جو حق و باطل کی رزمگاہ ہے اور جس میں حق ہمیشہ باطل کا سر کچل دیتا ہے، باطل ہمیشہ حق سے ہار کھاتا ہے اور جو اس بنا پر کھیل کے ہر وصف سے خالی ہے بلکہ خدا کا کھیل کہیں اس کی اپنی فرشتوں کی مجلس میں قائم ہوتا جہاں باطل نہ موجود ہوتا نہ کچلا جاتا۔ لیکن اس کائنات میں باطل کا

جو انجام ہونے والا ہے اس کے پیش نظر انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس سے علاقہ نہ رکھے۔ لیکن افسوس ہے کہ منکرین خدا سے انکار کا راستہ اختیار کر کے باطل سے وابستہ ہو چکے ہیں اور باطل کے انجام سے بے خبر ہیں۔ اس مضمون کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۱۶)

(اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کی درمیانی مخلوقات کو بطور ایک کھیل کے نہیں بنایا اور اگر ہم کوئی کھیل قائم کرنا چاہتے تو اپنے قریب کی فرشتوں کی مجلس میں قائم کر لیتے بشرطیکہ ہم چاہتے بلکہ یہ کائنات حق و باطل کا میدان کارزار ہے جہاں ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں اور حق باطل کا سر کچل دیتا ہے یہاں تک کہ وہ مٹ جاتا ہے جو کچھ تم کہتے ہو اس کے لیے تم پر افسوس ہے)

تخلیق بالحق کے مضمرات

اگر کائنات ایک کھیل کے طور پر بنتی تو اس کے لاتعداد نصب العین ممکن تھے کیونکہ فرضی اور بناوٹی نصب العینوں کی کوئی حد نہیں ہو سکتی لیکن سچا نصب العین جس کا تقاضا خودی کی فطرت میں مضمر ہے فقط ایک ہی ہو سکتا ہے جب نصب العین خودی کی فطرت کے مطابق ہو یعنی حق ہو تو جو وجود نصب العین بنتا ہے وہ بھی حق ہوتا ہے اور حق کی خوبیوں اور قوتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے لہٰذا اس وجود کو جہاں تک ممکن ہو خود بھی اپنی نصب العینی صورت کی جانب بدلنا اور ڈھلنا پڑتا ہے اور اس غرض کے لیے ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشکلوں کا سامنا کر کے ان کو راستے سے ہٹانا پڑتا ہے اگر وہ وجود اپنی نصب العینی صورت میں نہ ڈھل سکے اور رکاوٹوں اور مشکلوں کے ساتھ تعاون کرے تو خدا کا جلال اس کو ان رکاوٹوں اور مشکلوں کے سمیت برباد کر کے خدا کے سچے نصب العین کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے اسی بنا پر قرآن حکیم نے کبھی یہ دعا سکھائی ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران: ۱۹۱)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کائنات (با حق پیدا کی ہے) با باطل پیدا نہیں کی تو سب عیبوں سے پاک ہے لہٰذا (اگر ہم کائنات کے سچے نصب العین کے مطابق خود ڈھل نہ سکیں تو ہماری مدد فرمایئے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لیجئے۔

مختصر یہ کہ ہر وہ چیز جو خدا کی صفات جمال و جلال کے عمل اور اظہار کی (یا دوسرے لفظوں میں خدا کے نصب العین کی) ممد و معاون ہے حق ہے اور ہر وہ چیز جو خدا کی صفات جمال و جلال کے عمل و اظہار کی (یا خدا کے نصب العین کی) ممد و معاون نہیں باطل ہے۔

قائماً بالقسط کا مطلب

خدا کا نصبُ العین جو برحق ہے خدا کی صفات برحق کا تقاضا ہے اور خدا کی صفات کے اظہار سے ہی عالمِ وجُود میں آسکتا ہے۔ لہٰذا اس کی تخلیق اور تکمیل ان خاص قوانین اور ضوابط کے ماتحت ہوتی ہے جو خدا کی صفات کے اندر بالقوہ موجود ہیں اور اس کے نصب العین کے مطابق ہیں۔ کائنات اپنی سطح پر خواہ وہ مادی ہو یا حیوانی یا انسانی خدا کے حکم سے ان قوانین و ضوابط پر چلنے کے لیے مجبُور ہے۔ ان ہی قوانین و ضوابط کو قرآن مجید نے قسط (عدل) کہا ہے جس کو خدا نے اپنی کائنات میں قائم کر رکھا ہے اسی لیے خدا قائماً بالقسط ہے۔ کائنات اپنے اندرونی ضبط اور نظم کے ساتھ اس لیے موجود اور قائم ہے کہ وہ ایک خاص نصب العین کی سمت میں جو حق ہے اور جس کا پالینا اس کے لیے ضروری ہے آگے بڑھ رہی ہے۔ بسا اوقات انسان چاہتا ہے کہ حق کے مقتضیات سے بے پرواہ ہو کر اپنی خواہشات کی تکمیل کرے اور اس کی خواہشات حق کے تابع نہ ہوں بلکہ حق اس کی خواہشات کے تابع ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ حق تابع نہیں بلکہ متبوع ہے اگر ایسا ہو سکتا تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا کیونکہ یہ نظام اپنے مقصد یا نصب العین پر قائم ہے اور اس صورت میں کائنات کا کوئی مقصد یا نصب العین باقی نہ رہ سکتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔ (المؤمنون: ۷۱)

اور اگر حق ان کے تابع ہو جائے تو آسمان اور زمین میں اور جو مخلوقات ان کے درمیان ہیں

رہی ہے ان میں فساد برپا ہو جاتے۔

یہی مطلب ہے قرآن حکیم کے اس ارشاد کا کہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات خدا کے تابع فرمان ہیں۔

لَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (آل عمران: ۸۳)

آسمان اور زمین کی تمام مخلوقات خدا کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوتے ہیں۔

تمام قوتیں جو کائنات کے نصب العین کی مخالف ہیں اور لہٰذا حق نہیں بلکہ باطل ہیں ان قوتوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں جو کائنات کے نصب العین کی معاون ہیں اور لہٰذا باطل نہیں بلکہ حق ہیں قرآن حکیم کی تعلیم وہ قوت ہے جو حق ہے اس کے ظہور کے بعد آخر کار تمام باطل تعلیمات کا مٹ جانا ضروری ہے۔

قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

کہہ دیجئے کہ وہ تعلیم جو حق تھی آگئی اور وہ تعلیمات جو باطل تھیں مٹ گئیں بیشک باطل اپنی فطرت کی وجہ سے مٹ جانے والا ہے

(جاری ہے)

بقیہ : تحفظِ اجناس خوردنی

میں جگہ جگہ حکمت کے موتی جڑ دیئے گئے ہیں لیکن اس کی مثال ایک بحر ذخار کی سی ہے کہ جس کی گہرائیوں تک پہنچنا ناممکن ہے۔ آپ دیکھئے کہ چودہ سو برس سے علماء و مفسرین اس اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کر رہے ہیں۔ ایک مفسر کے ہاتھ ایک نکتہ آجاتا ہے تو وہ اسے ہی انمول جوہر سمجھتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا اسی سے کوئی گوہر نایاب تلاش کر لیتا ہے اور فخر سے پھولا نہیں سماتا، صدیوں سے یہی احوال ہے اور آج بھی یہی کیفیت ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

سیّد شبیر حسین شاہ زاھد

قرآن مجید اور مستشرقین

قرآن مجید جو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا آخری آسمانی صحیفہ ہے، جو اپنے سے پہلے صحیفوں کا مصدّق اور مھیمن ہے۔ یہ ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا حرف حرف اور لفظ لفظ اپنے اندر معانی کا سمندرِ گہربار رکھتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کا قیامت تک نافذ العمل رہنا مقدّر ہو چکا ہے اور یہی وہ آسمانی ہدایت ہے جس پر عمل کرنا پیروکارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لازم ہو چکا ہے۔

مستشرقین وہ غیر مسلم "علماء" ہیں، جنہوں نے اسلام پر تحقیق کر کے اپنی ایک حیثیت متعین کی ہے۔ ان کی تحقیق کے بظاہر دو مقصد تھے۔ اسلام کو اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش کرنا اور اپنے آپ کو دین (اسلام) کے طالب علم ظاہر کرنا۔ لیکن ان لوگوں کا اصل مقصد اسلام میں کیڑے نکالنا ہوتا تھا اور ہے۔ نہ صرف یہ کہ غلط فہمی اور کم علمی کی بناء پر اسلام کے بارے میں بد ظنی کرتے ہیں بلکہ اسلام کو مسخ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس تمام تحقیق کی پشت پر جو ذہن کام کرتا ہے وہ اسلام دشمن ہوتا ہے، سوائے چند ایک مستشرقین کے جنہوں نے اسلام کی صداقتوں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اسلام کے اصولوں سے متأثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت بھی حاصل کی۔

نولڈیکے ایک جرمن مستشرق تھا۔ جس نے ۱۸۵۹ء میں قرآن مجید پر ایک مقالہ لکھا۔ جس کو اس نے نظر ثانی اور چند اضافوں کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا جس کا نام GESCHICHTE DES QORAN (تاریخ قرآن) رکھا۔ ولیم میور نے جب قرآن مجید پر کتاب لکھی، تو زیادہ تر اسی نولڈیکے کے اعتراضات پیش کئے تھے۔ جن کا حتمی جواب تو سر سید

احمد خاں نے "خطبات احمدیہ" میں دے دیا تھا۔ مگر ذیل کے چند اعتراضات کا جواب تا حال نہیں دیا جاسکا۔

ا۔ نولڈیکے کہتا ہے کہ "قرآن مجید میں بعض ایسی فاش تاریخی غلطیاں ہیں۔ جن سے اس کے مصنف کی (نعوذ باللہ) جہالت عیاں ہے مثلاً (۱) سورۃ قصص میں ہامان کو فرعون کا وزیر بنادیا۔ حالانکہ ہامان شاہ کیخسرو ایرانی کا وزیر تھا۔ جس کا ذکر توریت کی کتاب "ایستر" میں ہے۔ شاہ کے خسرو ایرانی فرعونِ مصر کے سینکڑوں برس بعد گزرا ہے۔ (۲) سورۃ مریم میں مریم کو ہارون کی بہن لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ہارون (حضرت مریمؑ سے) سینکڑوں برس پہلے وفات پا چکے تھے (۳) سورۃ مائدہ میں مسیح پر رول مائدہ کی کیفیت رسم "عشاءِ ربّانی" کی ایک خلاف واقعہ اور مضحکہ خیز تصویر ہے۔"

(۱) حضرت موسیٰؑ جس فرعون کے زمانے میں مبعوث ہوئے وہ قدیم مصریوں کی انیسویں سلطنت کا بادشاہ رعمسیس ثانی تھا۔ اور جس کے دور میں آپ نے مصریوں (یہودیوں) کی حمایت میں حکمرانِ مصر کے خلاف علم جہاد بلند کیا وہ "منفتاح" اول تھا۔ اسی کی لاش آج تک اللہ نے محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ فراعنۂ مصر نے اپنے دور میں مصر میں عالیشان عمارتیں اور بت خانے تعمیر کروائے۔ اس زمانہ کے مندروں کے کاہن اور بتخانوں کے پجاری دولت اور طاقت کے لحاظ سے سلطنت کا ایک قوی بازو سمجھے جاتے تھے۔ ان سب معبدوں میں مینڈھے کی شکل کے دیوتا "آمن" کا مندر بہت وقیع مانا جاتا تھا اور اس کے کاہنوں کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ سردار کاہن کو نبی اول کہتے تھے۔ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی یہی تھا اور مندروں کی عمارتوں کی تعمیر و زینت کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔ دیوتا کی فوج یعنی مندر کے سپاہیوں کا جنرل بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ نہ صرف "آمن" کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے۔ بلکہ تھیبس اور شمالی و جنوبی مصر کے تمام دیوتاؤں کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ یہی تھا۔ مندروں کے خدمت گار عموماً قیدیانِ جنگ ہوتے تھے۔ لیکن کاشتکار اور اہلِ حرفہ بھی قیدیوں میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ یہ لوگ کھیتوں میں کام کرتے، گلوں کی نگہ بانی کرتے، مندروں کی تعمیر میں اُن سے جبریہ خدمت لی جاتی اور اکثر سے سونا، چاندی اور دوسری

قدرتی پیداواریں بطور پیشکش وصول کی جاتیں۔ اندازہ ہے کہ صرف شہر تھیبس کے دیوتا "آمن" کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم $\frac{1}{7}$ آبادی پر اس کی حکومت تھی (دیکھو جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد دھم و قدیم مصریوں کا مذہب از ڈاکٹر اسٹنڈ روف) اب دیکھو قرآن مجید فرعون وہامان کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامٰنَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ[1] (بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر والے قصوروار تھے) یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرعون مصر کا بادشاہ ضرور تھا لیکن "آمن" کا سردار کاہن اور اس کے ساتھی بطور خود ایک طاقت تھے اسی لئے "جنودھما" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب قرآن میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور فرعون نے کہا درباریو! معلوم نہیں میرے سوا تمہارا کوئی خدا ہو۔ پس ہامان تو میرے لئے مٹی پکوا۔ اور ایک محل میرے لئے بنوا تو شاید (میں) موسیٰ کے خدا کو جھانک لوں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ (یعنی حضرت موسیٰؑ) جھوٹا ہے[2]"۔

یہ تذکرہ اوپر ہو چکا ہے کہ دیوتا "آمن" کا سردار کاہن میر عمارت بھی ہوتا تھا۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے اب رہ گیا یہ سوال کہ "آمن" کے سردار کاہن کو قرآن نے ہامان کیوں کہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ توریت میں حضرت موسیٰؑ کے بھائی کا نام ارون لکھا ہے اور وہ بنی اسرائیل کے سردار کاہن تھے۔ لیکن قرآن مجید نے ان کو ہارون کہا۔ اسی قبیل سے آمن کے سردار کاہن کو ہامان کہہ دیا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عبرانی کا آمن (دیوتا) معرّب ہو کر ہامان بن گیا ہو اور قرآن نے آمن کو ہامان کے نام سے یاد کیا ہو۔ لیکن آمن سے مراد آمن کا سردار کاہن مراد ہو۔

میونخ (جرمنی) میں مصر کا ایک قدیم مجسمہ موجود ہے، جس پر تحریر ہے کہ یہ مجسمہ آمن کے سردار کاہن بکن خونس کا ہے جو رعمسیس ثانی کے زمانہ میں تھا۔ نیچے مجسمہ کی خود نوشت ہے کہ بچپن سے کیوں کر درجہ بدرجہ اس نے ترقی کی اور انسٹھ (۵۹) برس کی عمر میں آمن کا سردار کاہن مقرر ہوا۔ بے شک یہ بکن خونس (مصری زبان کا لفظ) وہی

---

[1] القصص: ۸ [2] القصص: ۳۸

شخص ہے جس کو آمن کے سردار کاہن کی مناسبت سے قرآن نے ھامٰن کہا ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس کو فرعون کا وزیر لکھ دیا لیکن ثبوت کوئی نہ تھا۔ اس لئے مخالفین اعتراض کرنے لگے۔ لیکن جدید تحقیقات نے اس کی تائید کر دی کہ

"آمن کا سردار کاہن منجملہ دیگر اختیارات کے جنوبی مصر کا وزیر بھی مقرر ہوتا تھا"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد نہم ۵۴)

ب...... پادری سیل نے 'جو نولڈکے سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہو گزرا ہے۔ "اختِ ہارون" والے اعتراض کو نقل کر کے خود ہی اس کو رد بھی کیا ہے کہ

"اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قدیم تاریخ اور علم انساب سے ایسے ناواقف خیال کیئے جا سکتے ہیں جس سے ایسی فاش غلطی (کہ مریم کو ہارون کی بہن لکھ دیا) سرزد ہو گئی ہو۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ قرآن کے الفاظ سے یہ نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے۔ مثلاً اگر دو شخصوں کے ایک ہی نام ہوں اور ان کے والدین کے نام بھی ایک ہی ہوں تو اُن کو فرد واحد کیوں کر سمجھ سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے ایسی غلطی قرآن کے اُن دوسرے مقامات سے باطل ہو جاتی ہے۔ جہاں یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمدؐ کو معلوم تھا اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ عیسیٰؑ کا زمانہ موسیٰؑ سے صدیوں بعد میں ہے۔ (دیکھئے ترجمہ قرآن سورۃ آل عمران و سورۃ مریم) مریم کو ہارون کی بہن (قرآن نے) اس لئے کہا کہ وہ قبیلہ لوئی سے تھیں (جیسا کہ ایشبیع کے رشتہ دار ہونے سے معلوم ہوتا ہے) یا پھر بطور تشبیہ بیان کیا ہے"۔

بیشک اگر قرآن کے الفاظ اور اسلوب بیان پر غور کیا جائے تو مطلب صاف ہے کہ یہ بیان تشبیہ کے طور پر تھا۔ مثلاً سورۃ طٰہٰ میں گوسالہ پرستی کے معاملے میں جب حضرت موسیٰؑ غیظ و غضب میں حضرت ہارونؑ کے سر اور داڑھی کے بال کھینچتے ہیں تو آپ ان کے غصّہ کو دھیما کرنے اور محبت کو جوش دلانے میں یوں خطاب کرتے ہیں۔ يَا بْنَ أُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي[1]۔ اب یہاں یَابْنَ اُمَّ سے یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ کے سوتیلے بھائی تھے۔ اسی طرح یہاں اُختَ ہارُون (سورۃ مریم میں) کہہ

---

[1] طٰہٰ : ۹۴

دینے کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی حضرت مریم حضرت ہارون کی سگی بہن ہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ اور آپ کی نسل معبد کی خدمت کے لئے مخصوص تھی۔ حضرت مریم آپ کی نسل سے تھیں اور معبد کی نذر کی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہودیوں کے استعجاب اور غیرت دلانے والے انداز کو "یَا اُختَ ہَارُونَ" کہہ کر بیان کیا گیا ہو۔[1]

(۳) عیسائیوں کی رسم عشاءِ ربّانی (یوکیرسٹ) کا تعارف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ توکّل کو رفیق رکھتے تھے اور اپنے حواریوں اور پیروکاروں کو بھی یہی توکّل اور تواضع کی تعلیم تھی۔ یوکیرسٹ کے لفظی معنی بھی شکر گزاری کے ہیں۔ اس لئے کہ متوکّل انسان شکر گزار پہلے ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ (یوکیرسٹ) پہلے پہل آپ کے لئے استعمال ہوا۔ اپنی گرفتاری سے ایک دن پہلے بھی آپ نے ایک شب اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر روٹی کھائی۔ شکر خدا بجالائے اور اُن کو برکت دی۔ سینٹ پال' جس نے ابن اللہ کا نظریہ اختراع کیا' نے آپ کی اس نیک سیرت کو ایک پراسرار رسم کی شکل میں بیان کیا اور اس روٹی والے واقعہ کو "کفّارہ" پر منطبق کر دیا۔ (دیکھئے نامہ اول کارتھیاں (۱۱ / ۲۵-۲۳) پال کے اس نظریہ کو مرقس نے (۱۵ / ۵۲-۲۲) متی نے (۲۶ / ۲۹-۲۶) اور لوقا نے (۲۲ / ۲۰-۱۴) اپنی اناجیل میں شامل کر لیا۔ لیکن یوحنّا نے اس رسم کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ کہتا ہے کہ (آخر شب) مسیح نے حواریوں کے پاؤں دھلائے اور فرمایا کہ اسی طرح تم بھی خدمت کرو تا کہ مخدوم بنو (۱۳ / ۱۰-۱) پھر روٹی اور پیالہ سے مراد "آپؑ کی تعلیمات" قرار دیا ہے (۶ / ۵۱)

یہ خیالات یہودی فلسفی فائلو' جو کہ حضرت عیسیٰؑ کا ہم عصر تھا کی تعلیمات متعلقہ لوگاس (کلمۃ اللہ) کا آئینہ ہیں۔ اس نے بھی لوگاس کو مائدۂ آسمانی اور ساقی یزدانی قرار دیا تھا۔ بہرحال! حضرت عیسیٰؑ کے بعد سے آپ کی آخرِ شب والی رسم کو "پراسرار رسم" کے طور پر مروّج کر دیا گیا۔ جس میں رومی بت پرستوں کی رسم "اسرار مترا" کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ ہے رسم "عشاء ربانی" جو سینٹ پال کی تخلیق کردہ ہے اور جو ابن اللہ اور کفارہ کے نظریہ کو تقویت دینے کو گھڑی گئی ہے۔

---

[1] مریم : ۲۸

قرآن مجید میں یہ رسم مذکور نہیں سورۃ مائدہ میں صرف اسی قدر مذکور ہے۔ "جب حواریوں نے کہا اے عیسیٰؑ ابن مریم کیا تیرا رب قدرت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے مائدہ اتارے؟ کہا اگر تم ایماندار ہو تو اللہ سے ڈرو۔ حواری بولے کہ ہم اس (مائدہ) میں سے کھانا چاہتے ہیں۔ (تاکہ) ہمارے دل مطمئن ہوں۔ کہ معلوم کرلیں کہ تو نے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔ عیسیٰؑ ابن مریم نے کہا خداوند ہم پر آسمان سے مائدہ نازل کر کہ ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہو اور تیری نشانی (بھی) اور ہمیں رزق دے اور تو (ہی) بہترین ہے رزق دینے والوں میں سے۔ خدا نے کہا میں اس (مائدہ) کا اتارنے والا ہوں پھر تم میں سے جو کفر کرے گا مائدہ کے اترنے کے بعد' میں اس کو وہ عذاب دوں گا کہ کسی کو عالم میں نہ دیا ہو"۔ (المائدہ ۱۱۱ تا ۱۱۵)

حواریوں نے درویشانہ اور متوکل زندگی کے باوجود جب یہ الفاظ حضرت عیسیٰؑ سے کہے تو آپ نے ان کو ادب سکھانے کے لئے کہا کہ "خدا سے ڈرو" پھر انہوں نے اپنے مطالبہ کی وجوہات بیان کیں آپ نے دعا کی اللہ نے قبول فرمائی مگر نافرمانوں کے لئے وعید بھی سنادی۔ حواری یہ وعید سن کر مرعوب ہو گئے اور آئندہ ایسے سوال سے باز رہے۔ قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں کہ مائدہ اترا یا نہیں اور اترا تھا تو کیا تھا۔ (یہودیوں کے من و سلویٰ کی طرح مائدہ کی تفصیلات نہیں ہیں) لیکن مفسّرین نے "مائدہ" کے ضمن میں ایسی روایات بیان کر دیں' جن سے بالعموم یہ مشہور ہو گیا کہ مائدہ آسمان سے اترا تھا' جس میں لذیذ اور مرغن کھانے تھے۔ یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے (راوی حضرت سلمانؓ فارسی) کہ "جب حضرت عیسیٰؑ نے خوان (مائدہ) کا سرپوش کھولا تو اس میں مچھلی بھنی ہوئی' روغن اس کے سر سے جاری اور سرہانے نمک' پاؤں کی طرف سرکہ' گرداگرد ہر قسم کے ساگ اور پانچ روٹیاں' ایک پر زیتون' دوسری پر شہد' تیسری پر گوشت بریاں' چوتھی پر مسکہ اور پانچویں پر پنیر تھا۔ تیرہ سو آدمیوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر بھی وہ مچھلی ویسی ہی رکھی رہی"۔

نولڈیکے نے انہی روایات کو متن کلام مجید میں شامل سمجھ کر اعتراض کیا ہے لیکن ان سب کا ماخذ روایاتِ اہلِ کتاب ہیں اور اسی لئے ان کا شمار اسرائیلیات میں کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان روایات کی تائید انجیل مرقس کے باب ۶ کی آیات ۳۵ تا ۴۴ سے بھی ہوتی

ہے۔ پھر اسی انجیل کے باب ۸ میں بھی اسی طرح کی روایت ہے، جن کا یہاں نقل باعثِ طوالت ہو گا۔ مہربان حضرات متعلقہ انجیل یا تاریخِ صحف سماوی دیکھ لیں۔

(ب) نولڈکے کا اعتراض یہ ہے کہ "قرآن کی ترتیب ناقص ہے۔ سلسلۂ کلام منتشر اور ادبی حیثیت سے ادنیٰ پایہ رکھتا ہے۔ سورۃ یوسف ہی کو لو جس میں ایک مسلسل قصہ بیان ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی توریت کتاب پیدائش کے قصۂ یوسف کے مقابلہ میں پست نظر آتا ہے"۔

(ا) قرآن کے ادبی محاسن پر کلام کرنا ممکن ہی نہیں اس لئے کہ قرآن کو ادب کے معیاروں پر پرکھنا ادب سے کور ذوقی ہے۔ بلکہ ادب کے معیار قرآن مجید کے انداز اور طرزِ بیان سے قائم ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کا خود دعویٰ ہے۔ وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (اگر تم میں سے کسی کو اس قرآن میں کسی قسم کا (ادبی، تاریخی وغیرہ) شک ہے تو اس کے (انداز بیاں اور طرز ادا) مقابلہ میں صرف ایک سورۃ (سب سے چھوٹی الکوثر ۳ آیات) بنا لاؤ[1]۔ مگر عربوں کا فصیح اور قادر الکلام ہونے کے باوجود اس دعویٰ کے جواب میں آج تک ایک لفظ بھی پیش نہ کر سکنا اور اس کی ادبی حیثیت پر انگلی نہ رکھ سکنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک اعلیٰ پائے کی ادبی کتاب ہے۔

سید قطب شہید "التصویر الفنی فی القرآن" میں رقمطراز ہیں کہ "واقعہ نگاری کے دینی مقاصد فنی حسن و جمال کے جن طریقوں سے پورے ہوتے ہیں وہ طریقے چار ہیں۔

(ا) **طرزِ بیان کا تنوّع**..... اس سلسلے میں کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ پہلے واقعہ کا خلاصہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ پھر تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ بعض دفعہ کسی واقعہ کا انجام اور نتیجہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ پھر تفصیلات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات واقعہ کو بلا تمہید ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اور تفصیلات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ کبھی کبھی واقعہ کو افسانوی رنگ دیا جاتا ہے۔ چند الفاظ ذکر کئے جاتے ہیں جو آغازِ واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں پھر واقعہ خود بخود ہیرو کی زبان سے اگلوایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان تمام اقسام کا بیان ہے۔

---

[1] البقرۃ: ۲۳

اول کے لئے سورۃ الکہف ۹ - ۱۲، دوم کے لئے القصص ۲ - ۶ ، یوسف ۴ - ۶ ، سوم کے ضمن میں ولادتِ عیسیٰؑ کے سلسلہ میں حضرت مریم کا واقعہ اور آخری خصوصیت کے لئے سورۃ البقرہ - ۱۲۷ وغیرہ ملاحظہ فرمائی جائیں۔

(۲) طریق مفاجات کا تنوّع..... بعض اوقات واقعہ کی حقیقت کا ہیرو کو علم ہوتا ہے۔ نہ ناظرین کو۔ پھر یکایک اس کا انکشاف کر دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ناظرین کو تو اصلی راز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے، مگر واقعہ کے ہیرو اور کردار اصلیّت سے بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ناظرین کو واقعہ کے ایک حصہ سے آگاہ کر دیا جاتا ہے، مگر واقعہ کا مرکزی کردار اس سے آشنا نہیں کیا جاتا۔ اور ایک حصہ سے ناظرین اور ہیرو دونوں بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں تینوں قسم کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل کے لئے دیکھو قصہ موسیٰؑ و خضرؑ (سورۃ الکہف) دوئم کے لئے القلم ۱۷ تا ۲۰، ۲۱ تا ۲۵۔ سوئم کے لئے تختِ بلقیس کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے[1]۔ بعض دفعہ ہیرو اور ناظرین دونوں کو واقعہ کی تفصیلات سے بیک وقت آگاہ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ مریم میں ولادتِ مسیح کا واقعہ اسی ضمن میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) مناظر میں وقفہ..... واقعہ نگاری کی تیسری خصوصیت وہ وقفہ اور خلاء ہے جو ایک منظر اور دوسرے منظر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت یوسفؑ کا قصہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اٹھائیس مناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مناظر میں بار بار وقفہ آتا ہے۔ جو کہ اس واقعہ کی ادبی خوبی کی عمدہ ترین مثال ہے۔ مزید برآں..... اصحاب کہف، حضرت مریم اور حضرۃ سلیمان کے واقعات بھی اپنے اندر یہی ادبی خصوصیت رکھتے ہیں۔

(۴) منظر کشی..... قرآن جو مشاہد و مناظر بھی پیش کرتا ہے۔ ان کی اس انداز سے منظر کشی کرتا ہے کہ اس کا سامع و ناظر اسے ماضی کا واقعہ سمجھ کر سنتا ہے۔ مگر حال کی تصویر سمجھ کر منظر کشی سے سبق حاصل کرتا ہے۔ الکہف ۱۳ - ۱۶، الکہف ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷۔ اس خصوصیت کی عمدہ و بہترین مثالیں ہیں۔

قرآن میں جو آیات بظاہر مکرر نظر آتی ہیں ان میں خالصتاً ادبی دقائق اور نکات پائے جاتے ہیں۔ ہر تکرار میں کوئی ایسی بات ضرور پائی جاتی ہے جو دونوں (تکراروں) کے مابین

---

[1] النمل : ۳۸ تا ۴۲

وجہ فرق و امتیاز ہوتی ہے۔ یہ فرق معمولی بھی ہو سکتا ہے اور اہم بھی۔ اس سے تکرار کے وہم کا ازالہ ہو جاتا ہے اگرچہ تکرار میں دعوتی مقاصد بھی پنہاں ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ تکرار فنی حسن و جمال کی حامل بھی ہوتی ہے۔ سلسلۂ کلام کے انتشار کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن میں سلسلۂ کلام منتشر ہے ہی نہیں۔ جہاں جہاں ترتیب ٹوٹتی نظر آتی ہے وہاں معانی اور فن کے بڑے بڑے مقاصد پوشیدہ ہیں اور قرآن میں کلام غیر تسلسل کو تسلیم کر ہی لیا جائے تو کیا ادب کے واقفکاروں سے یہ حقیقت اوجھل ہے کہ کوئی کہانی یا قصہ بیان کرتے کرتے درمیان میں کسی غیر متعلقہ کلام کو لے آنا سامع کو دو طرح سے کلام کی طرف راغب کرتا ہے۔ اول قصہ یا کہانی کے بارے میں سامع یہ سوچتا ہے کہ "پھر کیا ہوا" اور قصہ میں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ دوم درمیانی کلام کو غیر ضروری سمجھنے کے باوجود اس کی غرض و غایت اور معانی میں غور کرتا ہے۔ بعض دفعہ کوئی بات اچھی طرح سمجھانے کے لئے اسے دوران کلام لایا جاتا ہے۔

حضرت یوسفؑ کا قصہ نولڈیکے نے اپنے اعتراض کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ اس کے بارے میں مختصراً و مجملاً تبصرہ تو یہی ہے کہ حضرت یوسفؑ کا قصہ جب ایک دفعہ چھڑ جاتا ہے تو آخر تک جاری رہتا ہے۔ بھائیوں کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا۔ مصر میں آپ کی فروختگی اور تربیت، عزیز مصر کی بیوی کا آپ کو ورغلانے کی کوشش کرنا اور آپ کا قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا۔ بادشاہ کے دو ملازموں (قیدیوں) کے خواب کی تعبیر بیان کرنا۔ پھر بادشاہ کے خواب کی تعبیر اور قید سے رہائی پانا۔ وزارت مالیات پر فائز ہونا، بھائیوں کی آپؑ کی خدمت میں حاضری، بنیامین کی آپ سے ملاقات، بھائیوں کا بنیامین کو مصر میں چھوڑ کر والد کی خدمت میں حاضر ہونا۔ آپ کے والدین اور اہل و عیال کی مصر میں آمد اور واقعہ کا اتمام و اختتام۔ قصۂ یوسف میں یہ ساری تفصیل دو وجہ سے مقصود تھی اول اثباتِ وحی و رسالت کے لئے۔ دوم اس لئے کہ یہ تفصیلات اپنی ایک دینی اور تبلیغی حیثیت رکھتی ہیں اور واقعہ کے بیان سے یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ یہ واقعہ وحی کے ذریعے معلوم ہوا۔ اس واقعہ کو قرآن نے "احسن القصص"[1] کہا۔ مگر فصیح البیان عربوں نے کبھی اس پر انگلی رکھنے کی جرأت نہ کی۔

---

[1] یوسف: ۳

اب توریت اور قرآن میں بیان کئے گئے قصّۂ یوسفؑ کے چند موازنے حاضر ہیں، تاکہ نولڈیکے کا اعتراض مکمل طور پر رفع ہو۔ (۱) توریت میں اس واقعہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔ "یوسف اپنے بھائیوں کی ناحق بدگوئی کرتے ہیں" جبکہ قرآن نے آپؑ پر اس طرح کا کوئی الزام نہیں لگایا۔ (۲) توریت میں یوسفؑ کو عزیز رکھے جانے کی وجہ آپ کا بوڑھاپے کی اولاد ہونا ہے۔ (یعنی آخری اولاد) جبکہ آپ سے چھوٹے بنیامین تھے۔ (۳) قرآن نے اس پورے واقعہ کو تسلسل سے بیان کیا ہے۔ مگر توریت میں تسلسل قائم نہیں اور اس قصّہ کے دوران آپ کے بڑے بھائی یہودا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں اپنی بیوہ بہو کے ساتھ یہودا کا زنا کرنا اور حرامی اولاد کا پیدا ہونا مذکور ہے۔ (۴) قصّۂ یوسفؑ میں زلیخا اپنی غیر ارادی فریفتگی اور یوسفؑ کے حسن کی جلوہ گری کے اظہار کے لئے عورتوں کی دعوت کرتی ہے اور وہ عورتیں آپؑ کے حسنِ لاثانی کو دیکھ کر اپنی انگلیاں کاٹ کر بدحواسی ظاہر کرتی ہیں۔ قرآن نے اس واقعہ اور اس کے نتائج و عواقب کو تفصیلاً بیان کیا ہے اس کے مقابلے میں توریت میں یہ واقعہ ہے ہی نہیں۔ جبکہ یہود کی کتابوں "مدارشِ یلقوت" اور "مدارش ابکھیر" میں یہ واقعہ موجود ہے۔ (۵) توریت میں حضرت یوسفؑ یہ کہہ کر کہ تعبیر خدا کے ہاتھ میں ہے ٥ (جیل میں) ساقی کے خواب کی تعبیر بتاتے ہیں۔ پھر جن الفاظ میں سفارش چاہتے ہیں ٥ ان سے لجاجت اور گدایانہ ابرام ٹپکتا ہے۔ قرآن میں تعبیر بتاتے وقت یہ فرماتے ہیں۔ "ٹھہرو میں تمہارا کھانا آنے سے پہلے ہی تعبیر کہہ دوں گا۔ مجھے تو یہ علم خدا نے سکھایا ہے (توحید پرستی کی تعلیم ہے) تعبیرِ خواب کے بعد ساقی سے صرف یہ کہتے ہیں۔ اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ (اپنے صاحب سے میرا بھی ذکر کرنا[1]) دیکھو اظہارِ مدّعا اور سفارش کے حصول کا انداز کیسا خودداری پر مشتمل ہے۔ یہ چند موازنے تھے جو مشتے از خروارے کے طور پر پیش کئے گئے۔ تفصیل کے طالب توریت و قرآن کے متعلقہ حصّے یا تاریخ صحفِ سماوی ملاحظہ کریں۔

شاہ ولیؒ اللہ اور شبلیؒ نعمانی نے فصاحت و بلاغتِ قرآن کے بارے میں لکھا ہے۔ "قرآن مجید عرب کی زبان میں اترا ہے اور مخاطب اوّل اس کے عرب ہیں۔ اس لئے ضروری

---

[1] یوسف: ۴۲

تھا کہ طرزِ بیان میں اسلوبِ عرب کی رعایت کی جائے۔ عرب قدیم کی جس قدر نثر و نظم موجود ہے۔ سب کا یہی طرز ہے کہ مضامین کو یکجا بیان نہیں کرتے بلکہ ایک بات کہتے ہیں، ابھی وہ ختم نہیں ہوئی کہ دوسرا ذکر چھڑ جاتا ہے۔ پہلی بات شروع ہوتی ہے پھر دوسرا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کا بڑا مقصود یہ ہے کہ توجّہ الی اللہ اور اخلاص و عبادت کے مضامین اس قدر بار بار کہے جائیں کہ مخاطب پر ایک حالت طاری ہو جائے۔ اس قسم کی تکرار ترتیب کی صورت میں ممکن نہ تھی"۔ (دیکھئے الفوز الکبیر از شاہ ولی اللہؒ و علم الکلام از شبلیؒ نعمانی)

(ج) نولڈیکے کہتا ہے کہ "قرآن مجید کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ خالص عربی زبان میں نازل ہوا ہے لیکن اس میں غیر عرب زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نولڈیکے نے علم السنہ کے اصول سے بالکل چشم پوشی کی ہے۔ اس دور کے مکہ کی صورت حال یہ تھی کہ مکہ اس زمانہ میں ایک تجارتی شہر تھا۔ اور کعبہ کی زیارت کو لوگ دور دور سے آتے تھے اور قریش ممالکِ غیر میں تجارت کرنے جاتے تھے۔ اس لئے ان کی زبان بھی الفاظ کا لین دین کیا کرتی تھی اور غیر زبانوں کے الفاظ معرّب ہو کر بے تکلف استعمال ہوتے تھے۔ اور اس طرح جزوِ زبان ہو جاتے تھے کہ فصحاء اور شعراء ان کو بے تکلّف استعمال کرتے تھے۔ زندہ زبانوں کی نشوونما اور ترقی کا راز یہی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ عبرانی اور سریانی کے برخلاف عربی زبان اس زمانہ میں بھی زندہ زبان تھی اور اب بھی ہے اور قیامت تک رہے گی۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں غیر عربی الفاظ کی شمولیت اس کے دعویٰ "عربیٌّ مبینٌ"[1] کے منافی نہیں۔ یاد رہے کہ قریش نے قرآن کی ادبی، تاریخی، مذہبی، تبلیغی، فنی اور لغوی حیثیتوں پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ وہ قرآن کو اساطیر الاولین، سحر، کذب و افتراء اور پتہ نہیں کیا کیا کہتے رہے۔

(د) نولڈیکے نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ اکثر جگہ (غیر عرب زبانوں کے الفاظ) ان کے معنی میں قرآن کے اصل کے خلاف کہا ہے۔ مثلاً علیّون کے معنی عبرانی میں برتر اور اعلیٰ کے

---

[1] الشعراء: ۱۹۵

ہیں اور توریت میں خدا کا نام لیکن قرآن کی سورۃ مطفّفین میں بمعنی آسمانی کتاب کے نازل ہوا ہے۔ یہ بھی نولڈیکے کی غلط فہمی ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ یوں آیا ہے۔ اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِيْ عِلِّيِّيْنَ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ[1]

علیّون، علّیین کی دوسری شکل ہے۔ اس کا مادہ علو ہے جس کے معنی وہی ہیں جو عبرانی میں ہیں اور جن کا نولڈیکے نے ذکر کیا ہے توریت میں اس کا استعمال یوں ہوا ہے۔ و ھو کھن لال علیّون (اور وہ خدائے تعالیٰ کا کاہن تھا) ترجمہ توریت پیدائش ۱۴/۱۸ میں العلیّون کے معنی "خدائے تعالیٰ" ہیں۔ جس کا عربی مترادف "العلیٰ" ہے۔ دیکھو علیّون یہاں آل کی صفت ہے۔ یہود میں خدا کا اسم ذات یہوہ تھا۔ جیسے عربی میں اللہ اور عام لفظ خدا کے واسطے "ال" اور بصورت جمع "الوہیم" ہے۔ اسم صفت میں الشدائے بمعنی قدیر و قادر استعمال ہوتا ہے۔ اور علیّون بمعنی برتر اور اعلیٰ استعمال ہوا ہے۔

قرآن میں جس طرح وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ[2] فرمایا ہے۔ اس کے مقابلہ میں علیّون و علّیین کو کتب مرقوم کہا ہے۔ جس کے معنی بروایت ابن عباسؓ "جنّت" بروایت کعبؓ و قتادہ "قائمہ جانب راست عرش" اور بروایت ضحاک "سدرۃ المنتہیٰ" آیا ہے۔ غرضیکہ سب میں لفظی معنی کی مناسبت کا لحاظ ہے۔ (بحوالہ تفسیر ابن جریر)

یہ نولڈیکے کے اعتراضات اور ان کی حقیقت تھی جو کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر سامنے آ گئی ہے۔

---

[1] المطفّفین: ۱۸ تا ۲۰ [2] المطفّفین: ۸-۹

تنویر قیصر شاہد

قرآن سے اقبال کی عقیدت

اقبال کو قرآن سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہوں نے ساری زندگی اس کے مطالعے میں بے قاعدگی نہ کی۔ کلام مجید کا انہوں نے باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ ان کا سارا فلسفہ اور شاعری قرآنی نظریات کے گرد گھومتی ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ نے سچ کہا کہ اقبال کی شاعری دراصل قرآن کریم کی تفسیر ہے۔ وہ بڑی محبت اور خشوع و خضوع سے کلام اللہ پڑھتے تھے۔ صبح کو قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرتے تھے کہ پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ غلام بھیک نیرنگ لکھتے ہیں۔ "..... ایک مرتبہ میں لاہور گیا۔ ٹرین ایسے وقت لاہور پہنچی کہ اقبال کے مکان پر پہنچنے کے بعد صبح کی نماز کا وقت تھا۔ میں اوپر پہنچا تو ایک کمرے سے تلاوت کلام اللہ کی بلند مگر نہایت شیریں اور درد انگیز آواز میرے کانوں میں آئی میں سمجھ گیا کہ یہ کس کی آواز ہے۔ میں نے فوراً جلدی جلدی وضو کیا اور نماز پڑھنے کے لئے اس کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ اقبال مصلّے پر بیٹھے قرآن حکیم پڑھ رہے ہیں۔ مجھ کو دیکھ کر انہوں نے مصلّٰی خالی کر دیا اور خود پاس کے کمرے میں چلے گئے میں نے اس مصلّے پر نماز پڑھی تو نماز میں خاص کیفیت محسوس کی اور میں نے اپنے دل میں اس وقت یہ کہا کہ یہ کیفیت وہ شخص یہاں چھوڑ گیا ہے جو ابھی ابھی یہاں بیٹھا کلام اللہ پڑھ رہا تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ اقبال صبح کی نماز بہت سویرے پڑھ کر تلاوت کیا کرتے ہیں مگر نمونہ اس روز دیکھا....."

ان کی مشہور عالم مثنوی "اسرارِ خودی" اقبال کے قرآن مجید کے گہرے مطالعہ کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ غلام بھیک نیرنگ کو مثنوی کی اشاعت سے پہلے ایک خط میں لکھا:

"میں نے اس مرتبہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ خیالات قائم کئے ہیں"۔

مرزا جلال الدین رقم طراز ہیں۔

"مطالبِ قرآنی پر اقبال کی نظر ہمیشہ رہتی ہے۔ کلام پاک کو پڑھتے تو ایک ایک لفظ پر

غور کرتے بلکہ نماز کے دوران میں جب وہ بآواز بلند قرآن پڑھتے تو آیات قرآنی پر بھی ساتھ ساتھ غور و فکر کرتے اور ان سے متأثر ہو کر رو پڑتے ڈاکٹر صاحب کی آواز میں ایک خاص کشش تھی جب وہ قرآن پاک کو پڑھتے تو سننے والے کا دل پگھل جاتا"۔

علامہ اقبال کے منثور اور منظوم کلام کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے کوئی بات قرآن و سنت سے ہٹ کر نہیں کہی۔ آپ کی تعلیمات کا منبع اور سرچشمہ قرآن و اسوۂ حسنہ ہے۔ جن کے عقائد و عمل کا ماخذ کتاب و سنت تھا اقبال ان کے قدموں پر ٹوپی کیا اپنا سر رکھنے کو تیار تھے۔ وہ اس کردار کے حامل لوگوں کی صحبت کے ایک لحظہ کو دنیا کی تمام عزت و آبرو پر ترجیح دیتے تھے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے بالکل بجا کہا ہے: "اقبال قرآن کا شاعر ہے"

اور بقول پروفیسر حمید احمد خان "اقبال کا قول قرآن کریم کے قائم کئے ہوئے نظامِ حیات کی تفسیر اور رسول کریمؐ کے ارشادات کی والہانہ ترجمانی ہے"۔

معروف شارحِ اقبال، پروفسر یوسف سلیم چشتی نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے۔

"جس شخص نے قرآن کریم پڑھا اور سمجھا نہیں ہے وہ کلام اقبال کا مفہوم پانے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتا اور اس کا سبب یہ ہے کہ کلامِ اقبال کا ماخذ و منبع اور محور قرآن کریم ہے، اس لئے پہلے قرآن کو پڑھیئے، پھر اقبال کے کلام سے لطف اور فیض حاصل کیجئے"۔

فقیر سید وحید الدین بیان کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب اپنی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں قیام فرما تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کی قیام گاہ پر ایک نئے ملاقاتی آئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اتنے میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے ایک سوال کر دیا اور کہنے لگے۔ "آپ نے مذہب، اقتصادیات، سیاسیات، فلسفہ اور عمرانیات کے علوم پر جو کتابیں پڑھی ہیں ان میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور حکیمانہ کتاب آپ کی نظر سے کون سی گزری ہے؟"

ڈاکٹر صاحب اس سوال کے جواب میں کرسی سے اٹھے اور نو وارد ملاقاتی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا کہ تم ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے دو تین منٹ بعد واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اس کتاب کو انہوں نے اس شخص کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے

فرمایا: "قرآن کریم!"

علامہ اقبال کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ قرآن کریم کا علم مفقود ہوتا جارہا ہے وہ دلی طور پر خواہاں تھے کہ قرآن کی تعلیمات کا دور دورہ ہو اور لوگ سنتِ رسولؐ کا اتباع کریں۔

دوسری گول میز کانفرنس ستمبر ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوئی اقبال نے بھی اس میں شرکت فرمائی' انگلستان روانگی سے قبل اخباری نمائندوں نے آپ سے سوالات کئے۔ ہندوستان کرانیکلز کے نمائندے نے آپ سے دریافت کیا "آپ اس کانفرنس میں کیا خاص بات لے کر شامل ہو رہے ہیں؟"

علامہ اقبال نے جواب دیا "میرے پاس کچھ نہیں ہے لیکن قرآن ہے' میں اس کو پیش کروں گا"۔

اس طرح تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہونے سے پہلے اقبال نے ۱۸ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو جو بیان دیا اس میں بھی ان کی قرآن سے بے پناہ محبت آشکارا ہوتی ہے۔ فرمایا "میں سمجھتا ہوں کہ میں اس سے بہتر اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کو قرآن کریم کے بیان کردہ اصول عمل یاد دلاؤں"۔

مولانا سید مودودی نے اقبال کے قیام یورپ کی زندگی کا بڑے دلکش اور حسین انداز میں تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا "سب جانتے ہیں اقبال نے مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ' یہی ادب' یہی اقتصادیات' یہی سیاسیات' یہی قانون اور یہی فلسفہ انہوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفر تک کر چکے ہیں۔ جس 'مشروب' کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں' یہ صوفی کامل اس کے سمندر پیئے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے ۹۹ فیصد نوجوان دیکھتے ہیں' بلکہ وہ (اقبال) اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اتر چکا تھا۔ اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں نوجوان اپنے دین و ایمان' اپنے تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی

زبان بولنے کے قابل تک نہیں رہتے لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا' اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے بھی زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کی تہ تک پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔ حقیقت اور قرآن اس کی نظر میں شے واحد تھے۔ اور اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا۔ اقبال بلاشک وشبہ گذشتہ چار سو برسوں کے تمام مفسرینِ قرآن کا لیڈر نظر آتا ہے"۔

اقبال کی بہنوں کی زندگیاں پریشانیوں ہی میں گزریں۔ ان کی سب سے بڑی بہن فاطمہ بی کے اپنے شوہر سے اچھے تعلقات نہیں تھے اس سے چھوٹی بہن طالع بی جواں عمری ہی میں وفات پا گئیں۔ اقبال کی چھوٹی بہن کریم بی اپنے شوہر کی دوسری شادی کے باعث عرصہ تک اپنے بھائیوں کے پاس رہیں۔ سب سے چھوٹی بہن زینب بی کی شادی وزیر آباد میں ہوئی تھی لیکن غالباً اولاد نہ ہونے کے باعث ان کی خوش دامن نے انہیں سسرال میں خوشی اور امن سے نہ رہنے دیا اور مجبوراً میکے چلی آئیں۔ کئی سال وہیں رہی۔ اس دوران میں ان کی ساس نے بیٹے کی شادی کسی دوسری جگہ کر دی بعد میں اپنی اس دوسری بہو پر بھی سوتن لے آئیں۔ اقبال کے بہنوئی ایک سعادت مند بیٹے کی طرح زندگی بھر اپنی ماں کے احکام کی تعمیل کرتے رہے لیکن ماں کی وفات کے بعد انہوں نے اپنی پہلی بیوی کو بسانا چاہا۔ مصالحت کی کوششیں ہونے لگیں اقبال کے والدین بالآخر رضامند ہو گئے لہٰذا اقبال کے بہنوئی ان کی رضامندی کا سہارا پا کر کچھ عزیزوں کے ساتھ زینب بی کو لے جانے کے لئے اپنے سسرال آئے۔ اتفاق سے ان دنوں اقبال بھی سیالکوٹ میں تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ بہنوئی مصالحت کی غرض سے آئے ہیں' تو وہ بہت برہم ہوئے۔ والد نے بہت سمجھایا لیکن اقبال یہی کہتے رہے کہ مصالحت ہرگز نہ ہوگی' آنے والوں کو واپس کر دیا جائے والد نے جب دیکھا کہ وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تو انہوں نے اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں "وَالصُّلْحُ خَيْرٌ" کہا ہے اتنا سننا تھا کہ اقبال خاموش ہو گئے۔ چہرے کا رنگ متغیر ہو

گیا جیسے کسی نے سلگتی آگ پر برف کی سل رکھ دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد والد نے پوچھا کہ پھر کیا فیصلہ کیا جائے۔ اقبال نے جواب دیا:

"وہی جو قرآن کہتا ہے"۔ چنانچہ مصالحت ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کو جو نور معرفت، عظیم بصیرت اور بے نظیر شاعرانہ عظمت ملی وہ سب کچھ قرآن ہی کی مرہون منت ہے ان کی مشہور عالم کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" جو دراصل انگریزی کے سات خطبوں پر مشتمل ہے، ان کے اس عظیم الشان فکر کی آئینہ دار ہے جو انہوں نے قرآن پاک سے حاصل کی۔ قرآن پاک کی تلاوت کے دوران میں ان کی آنکھوں سے آنسو رواں دواں رہتے تھے۔ سید نذیر نیازی کا بیان ہے کہ میں نے بارہا دیکھا کہ اقبال تلاوت کلام پاک میں محو ہیں اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہے۔ ان کے آنسوؤں سے قرآن پاک کے صفحے بھیگ بھیگ جاتے تھے۔ اقبال کی بینظیر فکر، جس نے پوری عالم انسانیت کو متاثر کیا، کا سرچشمہ دراصل قرآن ہی ہے۔ قرآن ہی ان کا غم خوار اور دمساز تھا اور وہ اس کے مطالعے سے کبھی غفلت نہ برتتے تھے۔ سر راس مسعود کو لکھتے ہیں۔

"..... اور اس طرح میرے لئے ممکن ہو سکتا تھا کہ میں قرآن مجید پر عہدِ حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے اس نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا" ایک اور جگہ راس مسعود کو ایک خط میں قرآن سے محبت کا اظہار یوں فرمایا:

"..... چراغِ سحر ہوں، بجھا چاہتا ہوں" تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے، اسے اس خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جد امجد (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم الشان دین کی جو حضورؐ نے ہم تک پہنچایا، کوئی خدمت بجا لا سکا"۔

(بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

تبصرۂ کتب

مولانا ابوالکلام آزاد مرتب پروفیسر ہمایوں کبیر قیمت ۶۰/- روپے۔ ملنے کا پتہ المحمود اکادمی عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور۔

مدتوں مولانا آزاد کے سیکرٹری اور آزاد انڈیا میں مرکزی وزیر رہنے والے پروفیسر ہمایوں کبیر علم وفضل کے حوالہ سے بڑی قدآور شخصیت ہیں جن کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا آزاد جیسے عظیم مدبر و رہنما کی رفاقت میں انہیں مدتوں کام کا موقع ملا۔

مولانا کی ۷۰ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کی غرض سے ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ وہ ملک و بیرون ملک کے اصحاب علم و دانش سے مولانا کے متعلق تحریرات حاصل کرکے "کتاب المیلاد" کے نام سے ایک مجموعہ مولانا کی خدمت میں جلسہ عام میں پیش کرے۔ ۱۱ نومبر ۱۹۵۱ء کو ہونے والا یہ کام اس طرح متاثر ہوا کہ مولانا ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو رحلت فرما گئے۔ تاہم کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ یہ کام جاری رکھا جائے اور اب اسے "کتاب التذکرہ" کے نام سے چھاپا جائے۔ ہمایوں کبیر صاحب نے بطور سیکرٹری اس مجموعہ کو مرتب کیا۔ تمام تر مقالات انگریزی میں تھے جنھیں لکھنے والے دنیا بھر کے چیدہ انسان تھے۔ یہ انگریزی مجموعہ شائع ہوا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور مرحوم حیدرآباد دکن کی نامور علمی شخصیت ڈاکٹر میر ولی الدین نے اسے اردو کا جامہ اس طرح پہنایا کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہونے لگا اور پھر یہ مجموعہ "کتاب التذکرہ" کے نام سے حیدرآباد سے شائع ہوا جسے اب آزاد صدی کی نسبت سے پاکستان میں المحمود اکادمی نے شائع کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

ہر بڑے آدمی کی طرح مولانا بھی فتنۂ معاصرت کا شکار ہوئے اور بعض بڑے قدآور لوگوں نے — جن کا بعض طبقات پوجنے کی حد تک احترام کرتے ہیں مولانا کے متعلق نہایت ناروا رویہ اختیار کیا اور ان کے اجلے دامن پر داغ و دھبے لگانے کی سعی نامشکور کی لیکن ملت کے مخلص رہنما اور علوم اسلامیہ کے خدمت گزار ابوالکلام کو اپنے ہی دور میں اور پھر اس کے بعد جتنے عقیدت مند میسر آئے ان کا عشر

(باقی صـ۲۳ پر)

تصانیف ڈاکٹر اسرار احمد

		اعلیٰ	اشاعتِ عام
اسلام اور پاکستان			
استحکامِ پاکستان		۴۰-۰۰	۲۵-۰۰
استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ			۱۵-۰۰
شادی بیاہ کے ضمن میں ایک اصلاحی تحریک		۴-۰۰	۲-۰۰
اسلام کا معاشی نظام		۶-۰۰	۳-۰۰
علامہ اقبال اور ہم			۳-۰۰
قربِ الٰہی کے دو مراتب		۱۰-۰۰	۵-۰۰
جہاد بالقرآن			۵-۰۰
قرآنِ حکیم اور ہماری ذمہ داریاں			۲-۰۰
سرافگندیم	(تنظیم کا پس منظر)		۸-۰۰
تحریکِ جماعتِ اسلامی	(ایک تحقیقی مطالعہ)	۲۰-۰۰	۱۰-۰۰
منہج انقلاب نبوی			۲۵-۰۰
تنظیمِ اسلامی کی دعوت			۶-۰۰
مسلمانوں کے دینی فرائض اور اسوۂ رسولؐ		۱۰-۰۰	۵-۰۰
فرائضِ دینی کا جامع تصوّر		۴-۰۰	۲-۰۰
توحیدِ عملی			۱۵-۰۰

JANUARY 1989 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 8
NO. 1

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ——— اور ——— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ